اقبال ریویو

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کا شش ماہی ترجمان

خصوصی پیشکش

اقبال کی شعری زبان کا ارتقاء اور نظریۂ زبان

اقبال اکیڈیمی، حیدرآباد، انڈیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کاشش ماہی ترجمان

(نومبر ۲۰۰۴ء)

اقبال ریویو

خصوصی پیشکش

اقبال کی شعری زبان کا ارتقاء اور نظریۂ زبان

جلد (۱۳) شمارہ (۲)

ISBN.81-86370-26-9

مجلس مشاورت

۱۔ پروفیسر سید سراج الدین (صدر اقبال اکیڈیمی حیدرآباد)
۲۔ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی (لاہور)
۳۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل (کراچی)
۴۔ جناب زکریا شریف (ممبئی)

مجلس ادارت

۱۔ جناب محمد ظہیر الدین احمد
۲۔ جناب محمد ضیاء الدین نیر
۳۔ جناب وجیہ الدین احمد
۴۔ سید امتیاز الدین

بدل اشتراک

اس خصوصی شمارہ کا زرتعاون: ۴۰ روپے

عام شماروں کے لئے:

فی شمارہ ۳۰ روپے دو شمارے ۵۰ روپے، بیرونی ملک فی شمارہ ۴ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ :

اقبال اکیڈیمی، گلشن خلیل: 10-5-7/1 تالاب ماں صاحبہ ۔ حیدرآباد۔ 500028

آندھرا پردیش (انڈیا)۔ فون: 55663950

کمپیوٹر کمپوزنگ : محمد صلاح الدین، محمد کلیم محی الدین، ''شارپ کمپیوٹر'' محبوب بازار، چادرگھاٹ حیدرآباد۔۲۔ فون: 55704044

سید امتیاز الدین ایڈیٹر، پرنٹر و پبلیشر نے وی جی پرنٹر دلسکھ نگر، حیدرآباد سے طبع کروا کر اقبال اکیڈیمی حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست

سلسلہ نشان	عنوان	مضمون نگار	صفحہ نمبر
۱	کچھ اس شمارے کے بارے میں	اداریہ	۵
۲	اقبال کی شعری زبان کا ارتقاء	ڈاکٹر محمد ضیاء الدین احمد شکیب	۹
۳	اقبال کا نظریۂ زبان	پروفیسر عبدالستار دلوی	۴۷
۴	اردو زبان پنجاب میں (ماخوذ)	علامہ اقبال	۶۵
۵	زبان اردو (ماخوذ)	علامہ اقبال	۸۰
۶	اقبال کی خدمت میں انجمن ترقی اردو مدراس کا سپاس نامہ		۸۷
۷	مدراس میں دعوت ناموں کے عکس اور تصاویر		۹۴
۸	مولانا علی میاں بہ حیثیت ترجمان اقبال	پروفیسر رفیع الدین ہاشمی	۹۹
۹	کیرالا میں مطالعۂ اقبال اور عبدالصمد صمدانی	کے۔ پی۔ شمس الدین	۱۰۸
۱۰	اقبال اکیڈیمی کا سمینار	ادارہ	۱۱۶
۱۱	جانے والوں کی یاد آتی ہے (پروفیسر جعفر نظام اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے انتقال پر ملال پر تعزیتی شذرات)	ادارہ	۱۱۸

oooo

اس شمارے کے معاونین

ڈاکٹر محمد ضیاء الدین احمد شکیبؔ

مورخ اور محقق ہیں۔ اقبالیات سے گہری دلچسپی ہے۔ ''قطب شاہی۔ایران تعلقات'' پر ڈاکٹریٹ کیا۔لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز کے شعبہ انڈولوجی میں تدریس کے فرائض انجام دئے اور لندن ہی میں مقیم ہیں۔ غالبیات میں آپ کی تصانیف ''غالب اور حیدرآباد'' اور ''غالب اور ذکا'' قابل ذکر ہیں۔تصوف پر مولانا اسماعیل شہیدؒ کی ''عبقات'' کے علاوہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ''التشرف'' اور ''التکشف'' ایڈٹ کیں۔ اسٹیٹ آرکائیوز آندھراپردیش میں موجود عہد شاہجہانی کے اسناد کے کیٹلاگ کے علاوہ، برٹش لائبریری اور انسٹیوٹ آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز کے تحت برنداون کے اسناد پر متعدد کیٹلاگ مرتب کئے۔مختلف موضوعات پر کئی مقالوں کے مصنف ہیں۔

پروفیسر عبدالستار دلوی

ماہر لسانیات ہیں۔اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز لندن سے پی ایچ ڈی کی تکمیل کی بہ حیثیت صدر شعبہ اردو بمبئی یونیورسٹی ریٹائر ہونے کے بعد بھی علمی وادبی خدمات کا سلسلہ جاری ہے اور ان دنوں مخدوم عبدالرحمٰن مہائمی ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے ڈائرکٹر ہیں۔ اردو، فارسی، عربی، مرہٹی، کونکنی اور انگریزی کے علاوہ کئی زبانوں سے واقفیت رکھتے ہیں۔متعدد تحقیقاتی کتابوں اور مقالوں کے مصنف ہیں جن میں ''دکنی اردو''، ''ادب کا سماجی سیاق''، ''پونے کے مسلمان'' اور تازہ ترین کتاب ''بھرتری ہری'' اور ان کی شاعری کا ترجمہ قابلِ ذکر ہیں۔

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی

۱۹۸۱ء میں ڈاکٹریٹ کیا۔ پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں پروفیسر رہے۔اسلامیات، اردو ادبیات کے علاوہ خصوصاً اقبالیات پر آپ کی متعدد تصانیف ہیں۔جن میں ''اقبال کی طویل نظمیں''، ''خطوطِ اقبال''، ''اقبال بہ حیثیت شاعر''، ''تصانیف اقبال کا تحقیقی اور توضیحی مطالعہ''، ''اقبالیاتی جائزے'' ''کتابیات اقبال'' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔کئی تحقیقاتی وعلمی مقالات کے مصنف ہیں۔

کے۔پی۔شمس الدین

ترورکاڈ، ملاپورم (کیرالا) کے اسکول میں اردو کے استاد ہیں۔ کیرالا میں اُردو کے فروغ کی مساعی میں سرگرم ہیں۔ حال ہی روزنامہ ''منصف'' حیدرآباد میں کیرالا میں اردو کے موقف اور کیرالا میں اردو شاعری پر آپ کے مضامین شایع ہوئے ہیں۔

○○○○

اداریہ

کچھ اس شمارے کے بارے میں

اقبال ریویو کی زیرِ نظر خصوصی اشاعت' اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس شمارہ میں اقبال کی شعری زبان کے ارتقاء اور نظریۂ زبان پر پہلی مرتبہ عالمانہ اور تجزیاتی مقالے پیش کئے جارہے ہیں۔ اس موضوع پر بہت کم لکھا گیا ہے۔

ڈاکٹر محمد ضیاء الدین شکیبؔ کے مقالہ ''اقبال کی شعری زبان کے ارتقاء'' کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال کی شاعرانہ اردو زبان' ارتقاء کے کن کن مراحل سے گزری' نوجوان اقبال جب شاعری کے میدان میں اُترے تو دہلی اور لکھنو کے دبستانِ شعر کے مناقشے ان کے سامنے آئے۔ اقبال لڑکپن سے شعر کہنے لگے تھے اور ان کا کلام رسائل میں چھپنے لگا تھا۔ جاوید اقبال کے بیان کے مطابق ۱۸۹۵ء کی ایک شام ان کے چند ہم جماعت لاہور میں حکیم امین الدین کے مکان پر مجلس مشاعرہ میں لے گئے جہاں انہوں نے جو غزل سنائی' اس کا مقطع یہ تھا۔

اقبال لکھنو سے نہ دلّی سے ہے غرض ہم تو اسیر ہیں خمِ زلف کمال کے

اس مقطع کا پسِ منظر' حکیم احمد شجاع کی اس تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ ان مشاعروں میں مرزا ارشد گورگانی جو دلّی اسکول کے پیرو تھے اور میر حسین ناظم جو لکھنو کی زبان کے دلدادہ تھے شریک ہوتے۔ دونوں کی ٹولیاں ایک دوسرے کے مقابل ہوتیں اور اپنا اپنا رنگ جمانے کے لئے مصروفِ غزل خوانی ہوتیں (خون بہا۔ ص ۱۹۷) اقبال کی شاعری کی زبان پر بھی تنقیدیں ہونی لگیں۔ ان تنقیدوں کے جواب میں اقبال کا روّیہ نہایت متوازن اور مثبت تھا۔ وہ اپنی شاعری کی اصلاح کے لئے داغؔ سے رجوع ہوئے۔ اس سلسلہ میں پروفیسر مسعود حسین خاں کا یہ تبصرہ دلچسپ ہے کہ ''شاعری میں داغؔ نے اقبال کو بہت کم دیا ہے''۔ لیکن زبان کے حزم و احتیاط اور صحتِ الفاظ کی ٹوہ کا چسکا انہیں استاد کے کلام کو دیکھ کر ہوا۔ داغؔ کی شاگردی کا ایک سبب میرے خیال میں یہ

بھی تھا کہ اقبال' اہل زبان کی سند چاہتے تھے۔ داغ کے شاگردوں میں جھول نکالنے کے لئے ذرا کس بل کی ضرورت تھی''۔ (اقبال کی نظری و عملی شعریات۔ص۔۶۵) اس کے علاوہ اقبال نے دبستانِ لکھنو سے بھی بہت کچھ سیکھا۔ ڈاکٹر شکیب نے لکھنو اسکول کے نامور شعراء کی زبان' تراکیب اور محاورات وغیرہ سے استفادہ کی مثالیں دیتے ہوئے بتایا ہے کہ ان مراحل سے گزرتے ہوئے اقبال کی شاعری کمال تک پہنچ گئی۔ اس طرح نہ صرف فکر بلکہ شعری زبان کے اتباع میں کوئی اور شاعر اس بلندی تک نہ پہنچ سکا۔ ڈاکٹر شکیب کا یہ مقالہ صنفِ شاعری اور اس کے مختلف دبستانوں پر ان کی گہری اور وسیع مطالعہ کا آئینہ دار ہے' جو نہ صرف اقبالیات بلکہ اردو کے طالب علموں کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

یہاں اس بات کی وضاحت بے محل نہ ہوگی کہ اقبال نے اپنے خطوط اور اپنے اُردو و فارسی اشعار میں اور ہر زمانہ میں اس بات پر اصرار کیا ہے کہ زبان ان کا مقصود نہیں ہے' ان کے نزدیک زبان ثانوی حیثیت رکھتی ہے اور یہ کہ وہ زبان کو ایک بت تصور نہیں کرتے جس کی پرستش کی جائے۔ اس سے غلط فہمی نہ ہونی چاہئیے کہ اقبال زبان اور شعر کے فنی تقاضوں کو عملاً ثانوی سمجھتے ہوں۔ خود ان کے اپنے کلام میں محذوفات، اصلاحات اور ترمیمات اس کا ثبوت ہیں۔ اقبال کے زمانہ میں اکثر شعراء زبان آرائی میں اس قدر منہمک ہو گئے تھے کہ زبان ان کے نزدیک مقصود بالذات بن گئی تھی' جبکہ اقبال کے ہاں زبان اور فنِ شعر مقصود بالذات نہیں تھے۔

اپنی شاعری کے بارے میں..... ''میری نوائے پریشان کو شاعری نہ سمجھ'' وغیرہ جیسے خیالات کے پسِ منظر میں یہ بات بھی تھی کہ انہیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ لوگوں کی نظر ان کے کلام کے ظاہری حُسن پر زیادہ رہی۔ لیکن حُسن معنی اور کلام کے مقصود تک رسائی بہت کم ہوئی۔ انہوں نے شکایت کی تھی

''آشکارم دید و پنہانم نہ دید..... ''..... آں متاعم کہ شود دست زدِ بے بصراں''

اس بارے میں اقبال کا یہ احساس اتنا شدید تھا کہ وہ میر امم کے سامنے یوں فریاد کرتے ہیں۔

من اے میرامم داد از تو خواہم مرا یاراں غزل خوانے شمردند

اس لئے اقبال کا مطالبہ ہے کہ فتوحات جہانِ ذوق وشوق کو سمجھنے کے لئے نگاہِ شوق اور جذب دروں بھی چاہیئے ۔ یہ ضرور ہے کہ یہ منزل دشوار ہے۔ یہاں شاید یہ جملۂ معترضہ بے محل سمجھا جائے' لیکن اس پہلو کو بھی پیش کر دینا مناسب سمجھا گیا۔

اس شمارہ کا ایک اور عالمانہ مقالہ پروفیسر عبدالستار دلوی کا ہے۔ فاضل مقالہ نگار نے اقبال کے نظریۂ زبان کا ایک ماہر لسانیات کی حیثیت سے تجزیہ کیا ہے۔ اقبال نے جنوری ۱۹۲۹ء میں اپنے سفر مدراس کے موقع پر انجمن ترقی اُردو مدراس اور ہندوستانی پرچار سبھا کی جانب سے پیش کردہ سپاس ناموں کے جواب میں ''ہندوستان کی عالمگیر زبان'' کے موضوع پر تقریر کی تھی۔ اقبالیات کے بیشتر طالب علم اس تقریر کے متن سے ناواقف ہیں۔

(یہ تقریر اولاً سہ ماہی ''سفینہ'' محمڈن کالج مدراس جنوری ۱۹۲۹ء میں شایع ہوئی تھی جس کو سلیم تمنائی نے اپنی کتاب ''دانائے راز۔ دیار دکن میں'' دیگر تفصیلات کے ساتھ شامل کیا ہے) ہم پروفیسر عبدالستار دلوی کے بے حد ممنون ہیں کہ اس تقریر کے حوالہ سے انہوں نے ماہرانہ انداز سے اقبال کے لسانی تصوّرات اور نظریۂ زبان کو پیش کیا ہے۔ یہ تجزیہ اُس وقت کے سیاسی حالات کے تناظر اور اردو۔ ہندی کے مناقشے کے پس منظر میں نہایت قابل توجہ ہے۔ اس سے لسانی جھگڑوں کے بارے میں اقبال کی وسعتِ نظر کا اظہار ہوتا ہے۔ اقبال کے نظریۂ زبان پر اس زاویۂ نظر سے بہت کم لکھا گیا ہے۔

سطور بالا میں سفرِ مدراس کے موقع پر اقبال کے اعزاز میں انجمن ترقی اردو مدراس کی جانب سے پیش کردہ جس سپاس نامہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی اس شمارہ میں شامل کیا گیا ہے۔ اقبال کی شاعری پر جو اعتراضات کئے گئے تھے' اس کا جواب اقبال نے دیا تھا اور اپنے موقف کی تائید میں اساتذہ کے کلام کو بطورِ سند پیش کیا تھا۔ یہ مضمون ''اردو زبان پنجاب میں'' کے عنوان سے شایع ہوا تھا جس کے مطالعہ سے زبان کے بارے میں اقبال کی وسیع اور گہری نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اقبال نے اردو زبان کے بارے میں ڈاکٹر وائٹ برجنٹ کے ایک مضمون

کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ یہ مضامین مخزن ۱۹۰۲ء میں شایع ہوئے تھے اور تصدّق حسین تاج کی مرتبہ کتاب ''مضامین اقبال'' میں شامل ہیں۔ ان مضامین کو بھی موضوع کی مناسبت کے اعتبار سے پیش کیا جارہا ہے۔

اقبالیات کے فروغ میں پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کی خدمات گرانقدر ہیں۔ موصوف نے اپنے مضمون ''مولانا علی میاں بطورِ ترجمانِ اقبال'' میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کی اقبال سے بے پناہ عقیدت اور خصوصاً عالمِ عرب میں پیامِ اقبال کو متعارف کروانے میں ان کی خدمات کا احاطہ کیا ہے۔

ہندوستان کی مختلف ریاستوں اور مقامات پر اقبالیات پر جو کام ہورہا ہے۔ اس سے لوگوں کو بہت کم واقفیت ہے۔ جناب کے۔ پی شمس الدین نے کیرالا میں مطالعۂ اقبال کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا ہے۔ خصوصاً ایم۔ پی عبدالصمد صمدانی کی شخصیت اور ان کی مساعی کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ جناب صمدانی نے اپنے طور پر کیرالا میں نہ صرف ''ایوانِ اقبال'' کی تعمیر کا کارنامہ انجام دیا بلکہ وہ اقبال کے پُر جوش ترجمان اور اسکالر ہیں۔

حالیہ عرصہ میں پروفیسر جعفر نظام اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ جو ہمارے لئے بڑا صدمہ ہے۔ دونوں کا اقبال اکیڈیمی سے خصوصی ربط تھا۔ تعزیتی شذرات میں ان دونوں کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔

(محمد ظہیرالدین احمد)

ooo

محمد ضیاء الدین احمد شکیب

اقبال کی شعری زبان کا ارتقاء

اقبال پنجاب میں پیدا ہوئے۔ پنجابی اُن کی مادری زبان تھی' ساری عمر وہ اپنے اہل خاندان اور خاص احباب سے پنجابی میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ صرف اُنھی لوگوں سے اردو میں بات کرتے تھے جو پنجابی نہیں سمجھ سکتے تھے۔ لیکن اقبال نے اپنے تخلیقی اظہار کے لیے جو زبانیں اختیار کیں وہ اردو اور فارسی تھیں۔ اور اپنے حکیمانہ خیالات کے اظہار کے لیے انھوں نے انگریزی زبان اختیار کی۔ یہ تینوں زبانیں ان کی اکتسابی تھیں۔ انگریزی زبان میں چونکہ اعلیٰ تعلیم پائی تھی اس لیے بظاہر ایسا لگتا ہے کہ انھیں اسلامی الٰہیات سے متعلق اپنے خطبات ''Reconstruction of Religious Thought in Islam'' لکھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی ہوگی۔ لیکن جب ''اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید'' کے مشتملہ خطبات کو پڑھیں اور اس میں ان کے پیش کردہ افکار پر غور کریں تو خود ان خطبات کا بیش تر حصہ تخلیقی سطحوں کو چھو رہا ہے۔ اس کے لیے اقبال نے جس معیار کی انگریزی لکھی ہے اس سے اقبال کی لسانی صلاحیتِ اکتساب اور قوتِ اظہار کا اندازہ ہوتا ہے۔ اب رہی بات اردو اور فارسی کی تو اقبال نے یہ دونوں زبانیں اوائل عمر ہی سے سیکھنا شروع کیں اور ان میں بھی کمال حاصل کیا۔ اقبال کی فارسی شاعری اور اس کی زبان سے اس وقت قطع نظر کیا جائے گا۔ ان سطور میں اقبال کی شاعرانہ اردو زبان کے بارے میں کچھ گفتگو کی جائے گی۔

پنجاب کے شہری علاقوں میں اردو بہت کچھ بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ پنجاب کی علاقائی اردو کا اپنا ایک مزاج ہے۔ اور پنجابی علاقائی اردو' معیاری اور ٹکسالی اردو سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ اس کے باوجود پنجاب میں جو نصابی اور تدریسی اردو رہی ہے وہ ٹکسالی اور معیاری رہی ہے یعنی بچے گھر میں اور دوستوں بلکہ استادوں سے کبھی پنجابی میں بات کرتے اور کتابیں پڑھتے تو معیاری اردو کی' اور لکھتے تو معیاری اردو لکھنے کی کوشش کرتے۔

طالب علموں کو تو چھوڑیے پنجاب کے سارے پڑھے لکھوں، شاعروں اور ادیبوں کا یہی طرزِ عمل رہا ہے۔ اقبال بھی اسی ماحول میں پیدا ہوئے۔ اور ان کی ابتدائی تعلیم اردو میں ہوئی۔ اقبال کو نہایت ہی کم عمری سے اردو سے ایک خاص قسم کی محبت اور اس سے شغف ہو گیا تھا۔ چھ سات سال کی عمر میں ان کو اردو زبان میں بچوں کی کہانیاں پڑھنے اور ان کو پڑھ کر سنانے کا شوق پیدا ہوا۔ اقبال کی بھاوج مہتاب بیگم کہتی ہیں کہ:

''اقبال بڑے خوش گلو اور پُرسوز آواز کے مالک تھے۔ بچپن میں وہ ہمیں منظوم قصے بڑے پیارے لحن کے ساتھ سنایا کرتے تھے۔ اکثر اوقات قصے پڑھتے پڑھتے اپنی طرف سے بھی کوئی فقرہ (مصرعہ) اس میں جڑ دیتے تھے۔ ان کا فقرہ (مصرعہ) ایسا پُر اثر اور خوبصورت ہوتا کہ ہم سب بے ساختہ داد دیا کرتیں اس وقت ان کی عمر بہ مشکل دس بارہ برس تھی۔'' (۱)

اقبال کی انھی بھاوج کا بیان ہے کہ:

''عورتیں رات کو اِزار بند بُنا کرتی تھیں اور دیر تک ہم اس کام میں لگی رہتی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب اس زمانے میں چھوٹے تھے اور دو دو پیسے کے قصے بازار سے لاتے تھے۔ جب عورتیں اِزار بند بُنتی رہتیں، ڈاکٹر صاحب قصے پڑھتے رہتے۔ چونکہ آواز بہت اچھی تھی، اس لیے سب عورتیں خوشی سے سُنتیں۔'' (۲)

ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین کا بیان ہے کہ:

''اپریل ۱۸۸۸ء میں اقبال چھٹی جماعت کے طالب علم تھے۔ اس جماعت میں انھوں نے اسکول کی غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ جماعت میں بیت بازی کے مقابلوں میں پیش پیش ہوتے۔ اسکول میں تقریری مقابلوں میں حصہ لیتے اور ادبی مجالس میں شرکت کرتے۔'' (۳)

ظاہر ہے کہ یہ ساری بیت بازی اور ادبی سرگرمیاں اُردو ہی میں ہوا کرتی تھیں ساڑھے دس سال کی عمر میں ادبی مجلسوں میں شرکت کا شوق ایک غیر معمولی اور حیرت ناک بات تھی۔ ڈاکٹر

سید سلطان محمود حسین کا خیال ہے کہ انھوں نے ۱۹۸۸ء سے ۱۹۰۰ء کے زمانے میں شعر موزوں کرنا شروع کر دیا تھا اور اُنھی کا یہ بیان ہے کہ آٹھویں جماعت میں پہنچنے پر وہ سیالکوٹ کی شعری محفلوں میں شرکت کرنے لگے تھے۔ (۴)

اس زمانے میں اقبال نے جو کچھ کہا وہ اب دستیاب نہیں ہے۔ اقبال کا ابتدائی کلام جو دستیاب ہے وہ ستمبر ۱۸۹۳ء سے شروع ہوتا ہے اور یہ اُسی زمانے میں چھپنے بھی لگا تھا۔ گویا اقبال کا کلام اس وقت سے رسالوں میں شائع ہونے لگا جب وہ سولہ سال کے تھے۔ اس وقت انھوں نے اسکاچ مشن ہائی اسکول سیالکوٹ سے میٹریکیولیشن کامیاب کر کے اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ میں قدم رکھا تھا۔ ان کی سب سے پہلی غزل رسالہ ''زبان'' دہلی بابت ستمبر ۱۸۹۳ء میں شائع ہوئی وہ درج ذیل ہے۔

غزل

آبِ تیغِ یار تھوڑا سا نہ لے کر رکھ دیا
باغِ جنت میں خدا نے آبِ کوثر رکھ دیا

آنکھ میں ہے جوشِ اشک اور سینے میں سوزاں ہے دل؟
یاں سمندر رکھ دیا اور واں سمندر رکھ دیا

ہے یقین پھر جائے گا جب دیکھ لے گا وہ صنم
غیر کے گھر آج میں نے اپنا بستر رکھ دیا

بعدِ مردن بھی نہ ڈالا بار کچھ احباب پر
قبر پر میرا صبا نے جسمِ لاغر رکھ دیا

نقشِ پائے غیر دیکھے ہیں جو کوئے یار میں
رہ گزر میں میں نے خارِ جسمِ لاغر رکھ دیا

آمدِ خط سے ہوا پوشیدہ کب چاہِ ذقن
خضر نے اک چشمۂ حیواں چھپا کر رکھ دیا

ہنس کے پوچھا اس صنم نے ''کون ہے تیرا رقیب''
میں نے اس کے سامنے آئینہ لے کر رکھ دیا

کشتۂ رخسار کا ظاہر نشاں ہو' اس لیے
قبر پر اس نے ہمارے سنگِ مرمر رکھ دیا

خانۂ دل دے دیا ہے داغِ الفت کے عوض
رہن' میں نے اِک درم پر آج یہ گھر رکھ دیا

ہو نہ جائے پردۂ انوارِ حق تیرا نقاب
تو نے گر اس کو اٹھا کر روزِ محشر رکھ دیا

ہاتھ دھو بیٹھ آبِ حیواں سے خدا جانے کہاں　　خضر نے اس کو چھپا کر' اے سکندر رکھ دیا

قصہ خوانِ یار کو بھیجا ہے لکھ کر حالِ دل

ہاتھ میں قاصد کے میں نے ایک دفتر رکھ دیا　(۵)

اس غزل میں اقبال کی زبان نہایت صاف ہے۔ اس میں لفظی اور معنوی رعایتیں دیگر صنائع اور تلمیحات کا ایک ہجوم ہے۔ ظاہر ہے اس غزل کا کوئی شعر ان کی اپنی کیفیت کا نمائندہ نہیں ہے۔ بلکہ ہر شعر اقبال کی شاعرانہ صناعی کی نمائندگی کر رہا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال نے اردو شاعری کا مطالعہ بڑی گہرائی سے کیا اور اساتذہ کے یہاں مروجہ صنائع کی باریکیوں کو سمجھا۔ فارسی تراکیب کے حسن سے واقف ہوئے۔ شعری روایات کو سمجھا لیکن ان سب سے ہٹ کر اردو کے روزمرّہ اور محاورے کو جس طرح سے برتا' اس سے ان کی حقیقی زبان دانی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہر شعر میں کم از کم دو دو ورنہ تین تین' چار چار افعال مستعمل ہوئے ہیں۔ سولہ سال کی عمر میں کہی ہوئی اس غزل میں کوئی حقیقی جذبہ یا احساس ہو یا نہ ہو لیکن یہ بات بالکل نمایاں ہے کہ اقبال نے پوری شدت کے ساتھ غزل کے سارے عوامل کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ سب سے دلچسپ بات روزمرّہ اور محاورے کی ہے جس سے ان کی زباں دانی کا اندازہ ہوتا ہے۔ بارہ اشعار کی اس غزل میں اقبال نے چوبیس کے لگ بھگ با محاورہ افعال استعمال کیے ہیں۔ جیسے

ع　ہے یقین پھر جائے گا جب دیکھ لے گا وہ صنم　(دیکھ لینا' پھر جانا)

ع　بعدِ مردن بھی نہ ڈالا بار کچھ احباب پر　(کسی پر بار ڈالنا)

ع　خضر نے اِک چشمۂ حیواں چھپا کر رکھ دیا　(چھپا کر رکھنا)

ع　میں نے اس کے سامنے آئینہ لا کر رکھ دیا　(آئینہ لا کر رکھ دینا)

ع　ہاتھ دھو بیٹھ آبِ حیواں سے' خدا جانے کہاں　(ہاتھ دھو بیٹھنا)

ع　قصہ خوانِ یار کو بھیجا ہے لکھ کر حالِ دل　(حالِ دل لکھ کر بھیجا)

اس غزل میں صنائی اور فارسی تراکیب زیادہ ہیں۔اس کے دو مہینے بعد اقبال کی ایک اور غزل رسالہ 'زبان' دہلی نومبر ۱۸۹۳ء میں شائع ہوئی اور یہ طرحی غزل ہے

غزل

کیا مزہ بلبل کو آیا شیوۂ بے داد کا
ڈھونڈتی پھرتی ہے اُڑ اُڑ کر جو گھر صیاد کا

کس بتِ پردہ نشیں کے عشق میں ہوں مبتلا
حسرتِ دل پر ہے بُرقع دامنِ فریاد کا

جب دعا بہرِ اثر مانگی تو یہ پایا جواب
غیر رو کر لے گئے حصّہ تری فریاد کا

ہوں وہ ناداں ڈر سے زیرِ دام پنہاں ہو گیا
دور سے چہرہ نظر آیا اگر صیاد کا

سن کے اس کو بے رخی سے بھاگ جاتا ہے مدام
کیا اثر' معشوق ہے' اے دل تری فریاد کا

شرم آئی جب مری رگ میں لہو نکلا نہ کچھ
آب میں ہے غرق' گویا' نیشتر فصّاد کا

قمریوں نے باغ میں دیکھا ہے اس خوش قد کو کیا؟
ہے چھری ان کے لیے پتّا ہر اک شمشاد کا

بھول جاتے ہیں مجھے سب یار کے جور و ستم
میں تو دیوانہ ہوں' اے اقبالؔ' تیری یاد کا (۶)

دو مہینے کے اندر کہی ہوئی اس غزل میں ایک نمایاں تبدیلی دکھائی دیتی ہے۔سب سے پہلی تبدیلی یہ ہے کہ اس میں تلمیحات بالکل نہیں ہیں اور فارسی تراکیب پہلی غزل کی بہ نسبت کم ہو گئیں ہیں۔تاہم اس کا لب ولہجہ زیادہ سہل اور فطری ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کا ذہن صنائی سے گزر کر غزل میں زبان اور معاملہ بندی کے حسن کی طرف متوجہ ہو رہا ہے۔اس میں بھی افعال کافی آئے ہیں جس سے مضمون بندی متحرک اور ڈرامائی ہو گئی ہے۔اس میں ایسے محاورے بے تکلف آئے ہیں جیسے مزہ آنا' ڈھونڈتا پھرنا' اُڑ اُڑ کر ڈھونڈنا' عشق میں مبتلا ہونا۔کسی چیز پر برقع پڑنا' دعا مانگنا' جواب پانا' ڈر سے پنہاں ہو جانا' شرم آنا' لہو نکالنا' غرق آب ہونا' بھول جانا' دیوانہ ہونا وغیرہ۔پہلی غزل میں اقبال کا انداز صنائع سے بوجھل ہے۔اب وہ محاوروں سے

نکھر کر سبک ہو رہا ہے۔ یہ دونوں غزلیں اقبال کے یہاں لسانی اور فنی شعور کے ارتقاء کی نشاندہی کرتی ہیں اور یہ بات صاف سمجھ میں آتی ہے کہ پندرہ سولہ سال کی عمر میں اقبال غزل کے فن اور اس کے بھید بھاو سے اچھی طرح واقف ہو گئے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ اردو ہندوستان بھر میں بحیثیت زبان ہر طرف پھل پھول رہی تھی۔ اگر چہ حیدرآباد دکن اردو کا تیسرا بڑا مرکز اور پنجاب چوتھا اہم مرکز بن رہا تھا' یہ زبان کلکتہ' مدراس' بنگلور' راجستھان اور بہار میں بھی اپنا سکہ جما رہی تھی۔ اس کے باوجود ہر طرف دہلی اور لکھنو کی زبان کو معیار سمجھا جاتا تھا۔ اور یہ کوشش ہوتی تھی کہ دبستانِ دہلی یا دبستانِ لکھنو کی اتباع کی جائے۔ جن علاقوں میں دہلی اور لکھنو کے اساتذہ پہنچ چکے تھے وہاں ان دبستانوں کے مزاج اور محاوروں کا بڑا خیال رکھا گیا۔ حسن اتفاق سے نواب مرزا خاں داغؔ کی وجہ سے حیدرآباد دکن میں دبستانِ دہلی کو فروغ حاصل ہوا اور ساتھ ہی حضرت امیرؔ مینائی اور پھر ان کے شاگرد جلیلؔ مانک پوری کی وجہ سے دبستان لکھنؤ کو بھی اسی سرزمین میں فروغ حاصل ہوا۔ پنجاب میں دبستانِ دہلی کے اساتذہ کی آمد و رفت زیادہ رہی۔ ویسے دہلی ہندوستان کی راجدھانی تھی۔ لکھنو کے مقابلے میں دہلی کا نام ہمیشہ سے بڑا رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اردو نے دبستان لکھنو میں بحیثیت زبان جو ترقی کی اور حسنِ اظہار کی جس منزل تک پہنچی وہ زبان دہلی سے بہت آگے تھی۔ دبستان دہلی و لکھنؤ میں جو فرق تھا اس بارے میں اساتذہ میں تو نہیں البتہ متوسط درجے کے شعراء میں نوک جھونک بھی ہوتی رہی۔ پھر حالات نے ایک ایسا سمجھوتہ بھی کروا دیا کہ ان دونوں دبستانوں نے ایک دوسرے کو معیاری مان لیا۔ دہلی والوں میں بہت سے لکھنوی محاورے رائج ہو گئے اور لکھنو میں بھی دہلی کے کچھ روزمرّہ پہنچ گئے۔ تاہم ان دونوں زبانوں کا اختلاط ان کے اپنے گھروں ۔ اتنا نہیں ہوا جتنا باہر ہوا یعنی حیدرآباد اور پنجاب میں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عام طور پر دہلی اور لکھنو کی زبان کی تمیز مٹتی گئی۔ البتہ کچھ اساتذہ ایسے رہ گئے تھے جن کو ان دبستانوں کی زبان' روزمرّہ اور محاوروں کے اختلافات کی تمیز اور اُن کی پرکھ تھی۔

اقبال نے اردو زبان کی نشو ونما کے اس مرحلے میں شعر گوئی کا آغاز کیا۔ ہمارے خیال میں ابتداء ہی سے اُن کو زبان لکھنؤ کا ایک چسکا سا تھا۔ تاہم غالبؔ کا اثر ان پر بہت نمایاں ہے

۔ دوسری طرف اس زمانے میں داغؔ کا طوطی بول رہا تھا۔ داغؔ حیدرآباد دکن میں آصف سادس نواب میر محبوب علی خان (۱۸۶۹ء سے ۱۹۱۱ء) کے استاد اور ریاست حیدرآباد میں جو اس زمانے کی سب سے بڑی دیسی ریاست تھی' ملک الشعراء کا درجہ رکھتے تھے۔ وہ ملک الشعراء فصیح الملک' جہاں استاد نواب مرزا خاں داغ دہلوی کے نام اور القاب سے جانے جاتے تھے۔ یہ بالکل فطری بات تھی کہ نوعمر اقبال نے جب اپنے لیے فنِ شعر میں استاد کے لیے سوچا تو سب سے بڑا نام سوائے داغؔ کے اور کس کا ہو سکتا تھا۔ کسی بڑے استاد کی شاگردی میں آنے کی تمنا کرنا تو ایک فطری بات ہے۔ لیکن ایسی نوعمری میں محض نویں یا دسویں جماعت کا طالبِ علم ہوتے ہوئے یہ جسارت کرنا کہ اپنا کلام داغؔ جیسے ملک الشعراء کے پاس لاہور سے حیدرآباد بھیجے اقبال جیسا غیر معمولی لڑکا ہی کر سکتا تھا۔ فروری ۱۸۹۴ء میں رسالۂ ''زبان'' دہلی جلد ۴ شمارہ ۲ میں اقبال کی ایک اور غزل چھپی اور اسی شمارے میں اقبال کو شاگردِ بلبلِ ہند حضرتِ داغ دہلوی لکھا گیا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فروری ۱۸۹۴ء سے پہلے اقبال داغؔ کی شاگردی میں داخل ہو چکے تھے۔ نیز انھوں نے داغؔ کے رنگ میں شعر کہنے کی کوشش کی۔ (۷) پوری غزل یہ ہے

جان دے کر تمھیں جینے کی دعا دیتے ہیں
پھر بھی کہتے ہو کہ عاشق ہمیں کیا دیتے ہیں؟

کوچۂ یار میں ساتھ اپنے سلایا اُن کو
بختِ خفتہ کو مرے پانوں دعا دیتے ہیں

بدگمانی کی بھی کچھ حد ہے کہ ہم قاصد سے
قسمیں سو لیتے ہیں' جب ایک پتا دیتے ہیں

موت بازار میں بکتی ہے تو لادو مجھ کو
ہم نشیں کس لیے جینے کی دعا دیتے ہیں

رحم آتا ہے ہمیں قیس کی عریانی پر
دھجیاں دامنِ صحرا کی اُڑا دیتے ہیں

ایسی ذلت ہے' مرے واسطے عزت سے سوا
خود وہ اُٹھ کر مجھے محفل سے اُٹھا دیتے ہیں

غیر کہتے ہیں کہ یہ پھول گیا ہے مردہ
قبر پر میری' جو وہ پھول چڑھا دیتے ہیں

موت بولی' جو ہوا کوچۂ قاتل میں گزر
سر اسی راہ میں مردانِ خدا دیتے ہیں

ان کو بے تاب کیا' غیر کا گھر پھونک دیا
ہم دعائیں تجھے' اے آہِ رسا دیتے ہیں

گرم ہم پر کبھی ہوتا ہے جو وہ بُت اقبالؔ
حضرتِ داغؔ کے اشعار سنا دیتے ہیں (۸)

اس غزل میں کوئی ایسی بات نہیں کہی گئی ہے جو شاعر کے حقیقی نفسی تجربے کو ظاہر کرتی ہو۔ یہ بھی ایک مشقیہ غزل ہے۔ اس میں بھی غزل کی روایتوں سے بہت فائدہ اٹھایا گیا ہے اور رعایتِ لفظی و معنوی قدم قدم پر ملحوظ ہے۔ ایک دو تلمیحات بھی ہیں لیکن محاوروں کا استعمال بڑی بے باکی اور پھرتی سے کیا ہے۔ جیسے پانچویں شعر میں قیس کی عریانی کو اس قدر موثر بتایا ہے کہ وہ دامنِ صحرا کی دھجیاں اُڑا دیتی ہے۔ اس میں تخیل کی جو حیرت ناک بے باکی ہے وہ یقیناً مطالعۂ غالب کے زیر اثر ہے۔ ساتھ ہی محاورے کو جس بے تکلفی سے برتا ہے اس سے زبان کے معاملے میں اقبال کی خود اعتمادی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس غزل کے دس شعروں میں کم از کم تیس ۳۰ افعال اور بیس ۲۰ محاورے ہیں۔ غزل کے اکثر مضامین معاملہ بندی کے ہیں جو اقبال کے ابھرتے ہوئے تہذیبی شعور کی غمازی کرتے ہیں۔

اقبال کی یہ غزلیں ان کی عمر کے سولھویں سال میں کہی ہوئی ہیں۔ اس میں وہ کون سا وصف نہیں ہے جو صناعی اور خیالی مضمون بندی کی دھن میں رہنے والے اساتذۂ متقدمین و متاخرین کے یہاں نہیں پایا جاتا۔ بلکہ اقبال کے یہاں اس نوعمری میں حصولِ فن کی خواہش کا جو وفور ہے وہ غیر معمولی ہے۔ اس کی مثال کسی حد تک غالبؔ کے یہاں ملتی ہے۔ اسی عمر میں داغؔ نے اقبال کو ان کے کلام پر یہ سند دے دی کہ ''اصلاح کی ضرورت نہیں'' (۹)

یہ بات یقینی ہے کہ داغ سے پہلے اقبال نے اپنا کلام مولوی میر حسن کو دکھایا ہوگا۔ اقبال کی تعلیم و تربیت میں میر حسن جیسی باکمال شخصیت کا جو حصہ رہا ہے وہ غیر معمولی ہے۔ اس کا ابھی تک جائزہ نہیں لیا گیا۔ تاہم سید سلطان محمود حسین نے مولوی صاحب کی سوانح عمری لکھ کر اہم مواد محفوظ کر دیا ہے اور اس موضوع پر فکر و تحقیق کے دروازے کھول دیئے ہیں (۱۰)۔ بہر حال شاعری کے معاملے میں اقبال داغؔ کی شاگردی پر فخر کرتے رہے۔ غالباً یہ ان کی ابتدائی عمر ہی کا شعر ہے۔

جنابِ داغؔ کی اقبالؔ یہ ساری کرامت ہے
ترے جیسے کو کر ڈالا سخن داں بھی سخن ور بھی

شاعری میں صنائع کا رجحان دہلی اور لکھنؤ دونوں دبستانوں میں کافی زیادہ رہا ہے۔ صنائع کے ذریعہ محاوروں سے کھیلا جا سکتا ہے اور ان کا بخیہ ادھیڑا جا سکتا ہے لیکن ان کی وجہ سے زبان کا فطری حسن اور لہجہ دب جاتا ہے۔ اقبال کی جو دو غزلیں پیش کی گئی ہیں ان میں صنائع کے بوجھ تلے دبی ہوئی زبان کو دیکھا جائے تو صاف جھلکتا ہے کہ ان کی توجہ زبان اور محاورے پر بھی بہت تھی۔ حضرت داغؔ سے سند و اجازت حاصل کرنے کے بعد اس لڑکے میں اپنی زبان اور فن پر کتنا اعتماد بڑھا ہوگا' اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اقبال کسی عام شاعر کی طرح خوش فہمی کی موج میں بہہ نہیں گئے بلکہ انھوں نے اپنا صحیح محاسبہ کیا اور اردو زبان کے عظیم الشان شعری سرمائے کے مقابل اپنی بے بضاعتی کا صحیح اندازہ کیا۔ اور اردو زبان سیکھنے کا اپنا سفر جاری رکھا۔ جہاں تک ان کے فن کا تعلق ہے اس کی نشو و نما دہلی اور لکھنؤ کی اردو کے علاوہ فارسی' عربی' انگریزی' جرمن اور دوسری زبانوں کے ادبیات سے مختلف انداز میں متاثر ہوتا رہا ہے۔ یہ ایک علیحدہ موضوع ہے۔ اس وقت ہمارا سروکار ان کی اُردو زبان آموزی اور اُردو دانی سے ہے۔

اقبال کی ان دو ابتدائی غزلوں سے جہاں تک ان کی زباں دانی کا اندازہ ہوتا ہے، اس میں دو عناصر نمایاں طور پر کارفرما ہیں۔ ایک طرف ترکیب سازی کا رجحان اور دوسری طرف محاوروں کے برتاو کا۔ ترکیب سازی کا رشتہ ان کی فارسی دانی سے اور محاوروں کا رشتہ ان کی اُردو دانی سے رہا ہے۔ مندرجہ بالا غزلوں میں جو محاورے آئے ہیں' وہ دہلی اور لکھنؤ دونوں دبستانوں میں برتے جاتے ہیں۔ تاہم ہمارا احساس ہے کہ محاوروں کا بنیادی لہجہ جو اقبال کے یہاں ہے وہ بیشتر لکھنؤ سے مستعار ہے۔ لیکن داغؔ کا رنگ اختیار کرنے کی وجہ سے یہ خیال ہوتا کہ وہ محض دبستانِ دہلی کی اتباع کر رہے ہیں۔ اگر اقبال کے لسانی رجحانات کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ وہ نہ صرف دہلی اور لکھنؤ دونوں دبستانوں کا ادب پڑھتے تھے بلکہ ان دونوں کے امتیازات کو محسوس بھی کرتے تھے اور قطعی طور پر کسی ایک دبستان کا ہو رہنا نہ تو ان کے لیے ممکن تھا نہ ہی کارآمد۔ ایک برس بعد جب اقبال سترہ سال کی عمر کے ہوئے انھوں نے سولہ شعر کی ایک

غزل کہی جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اب ان طبیعت داغ والے دبستانِ دہلی سے اکھڑ کر امیر مینائی والے دبستان لکھنو کی زبان کے حسن پر مائل ہوگئی۔ یہ غزل یہاں نقل کی جاتی ہے۔

تم آزماؤ ''ہاں'' کو زباں سے نکال کے
یہ صدقے ہوگی میرے سوال وصال کے

جادو عجب نگاہِ خریدارِ دل میں تھا
بکتا ہے ساتھ بیچنے والا بھی مال کے

کم بخت اِک ''نہیں'' کی ہزاروں ہیں صورتیں
ہوتے ہیں سو جواب سوال وصال کے

ہم موت مانگتے ہیں وہ گھبرائے جاتے ہیں
سمجھے انھوں نے اور ہی معنی ''وصال'' کے

اے ضبط! ہوشیار ' مراحرفِ مدعا
قابو میں آنہ جائے زبانِ سوال کے

مارے ہیں آسماں نے مجھے تاک تاک کے
کیا بے خطا ہیں تیر کمانِ ہلال کے

ان کی گلی میں اور کچھ اندھیر ہونہ جائے
اے ضعف ! دیکھ مجھ کو گرانا سنبھال کے

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

میں نے کہا کہ ''بے دہنی اور یہ گالیاں''
کہنے لگے کہ ''بول ذرا منہ سنبھال کے

کہتے ہیں ہنس کے ''جایئے ہم سے نہ بولیے''
قربان جاوں طرزِ بیانِ ملال کے

بگڑے حیا نہ شوخیِ رفتار سے کہیں
چلتے نہیں وہ اپنا دوپٹہ سنبھال کے

تصویر میں نے مانگی تو ہنس کر دیا جواب
''عاشق ہوئے ہوتم تو کسی بے مثال کے''

چلتے ہوے کسی کا جو آنچل سرک گیا
بولی حیا'' حضور! دوپٹہ سنبھال کے''

حسرت نہیں' کسی کی تمنا نہیں ہوں میں
مجھ کو نکالیے گا ذرا دیکھ بھال کے''

کہتا ہے خضر دشتِ جنوں میں مجھے کہ ''چل
آتا ہوں میں بھی پاوں سے کانٹے نکال کے''

اقبال' لکھنؤ سے دلی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے (۱۱)

یہ غزل ٹھیٹ لکھنؤ کے مزاج کی ہے اور حضرت امیر مینائی کی اس غزل کی زمیں میں ہے

نازک بہت ہیں ہونٹ مرے نو نہال کے
ساقی پلائے پھول تو کانٹا نکال کے

اس میں اقبال نے ڈوپٹے اور آنچل کے مضامین بھی باندھے ہیں۔ اور معاملہ بندی میں بھی لکھنؤ کا رنگ اختیار کیا ہے اور اس میں بھی ہر شعر میں کم از کم تین افعال ہیں اور زیادہ تر افعال محاوروں سے بندھے ہوے ہیں۔ بعض مصرعوں میں مکالماتی انداز ہے۔

میں نے کہا کہ ''بے ڈھنی اور یہ گالیاں؟'' کہنے لگے کہ بول ذرا منہ سنبھال کے
کہتے ہیں ہنس کے ''جایئے ہم سے نہ بولیے'' قربان جاوں طرز بیانِ ملال کے
تصویر میں نے مانگی تو ہنس کر دیا جواب ''عاشق ہوئے ہو تم تو کسی بے مثال کے''!
چلتے ہوئے کسی کا جو آنچل سرک گیا بولی حیا ''حضور! دوپٹہ سنبھال کے''

استاد داغؔ کا شاگرد لکھنؤی زبان میں شعر کہہ رہا ہے جب کہ داغ کی شاگردی سے منسلک ہوئے اُسے دو تین برس ہی ہوئے ہیں۔ خود اقبال کو اس کا احساس ہے لیکن کمال تک پہنچنے کا ذوق اور تجسس ان کو رُکنے نہیں دیتا وہ اپنے اندر اس تبدیلی' کا جواز اس طرح پیش کرتے ہیں۔

اقبالؔ لکھنؤ سے نہ دلی سے ہے غرض ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

کہا جاتا ہے کہ لکھنؤ کا رسالہ ''پیامِ یار'' سیالکوٹ میں گھر گھر پڑھا جاتا تھا اور اُس میں اُن کا کلام چھپتا تھا (۱۲)

لڑکپن ہی سے اقبال کا کلام لاہور' حیدر آباد دکن' دہلی اور لکھنؤ کے رسالوں میں شائع ہونے لگا۔ اقبال کے یہاں دبستان لکھنؤ کے شعراء کا جس قدر اثر ہے اور ان کی تحریروں میں شعرائے لکھنؤ سے استناد کے جتنے حوالے ہیں اور امیر مینائی کے کلام سے ان کی دلچسپی اور لگاؤ میں جو شدّت ہے وہ اردو کے کسی اور دبستان کے اور شاعر کے ساتھ نہیں ملتی۔ شعراء دہلی میں انہوں نے زیادہ تر میر تقی میرؔ' مرزا رفیع سوداؔ' بہادر شاہ ظفرؔ مومن خاں مومنؔ' داغؔ دہلوی جن کے نام کے ساتھ وہ ہمیشہ دَامَ فیضہٗ لکھا کرتے تھے' کے علاوہ مصحفیؔ سے سندیں پیش کی ہیں۔ مصحفیؔ کا تعلق امروہہ اور

لکھنؤ سے رہا ہے۔ وہ دہلی اور لکھنؤ دونوں دبستانوں سے وابستہ رہے ہیں۔ لیکن دبستانِ لکھنؤ سے ان کی نسبت زیادہ استوار ہے۔ دبستان لکھنؤ کے شاعروں میں سے اقبال نے جن کے کلام سے استناد کیا ہے' ان میں ناسخ' آتش' جلال' برق' اسیر' ملول' میر انیس اور حضرت امیر مینائی کے نام قابل ذکر ہیں۔ اقبال نے اپنے ایک مضمون ''اردو زبان پنجاب میں'' میں اپنے کلام پر بعض اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ اور فصحائے دہلی اور لکھنؤ کے کلام سے نہ صرف سندیں پیش کی ہیں بلکہ دلیلیں بھی۔ ان دلیلوں سے اقبال کی سخن فہمی اور زبان دانی کا اندازہ ہوتا ہے۔ معاصر شعرائے لکھنو میں ناظر کاکوروی' مرزا علی ہادی عزیز لکھنوی اور یاس یگانہ چنگیزی سے ان کے تعلقات کی جو بھی نوعیت ہو اقبال ان کی زبان دانی کے معترف تھے۔ تلامذۂ امیر مینائی میں جلیل' مانک پوری' ریاض خیرآبادی' مضطر خیرآبادی' کوثر' عابد اور اختر سے بذریعہ مراسلت اقبال کے روابط تھے۔ (۱۳)

عزیز لکھنوی کے ایک شعر کی ستائش کرتے ہوئے اقبال لکھتے ہیں

اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

''سبحان اللہ یہ بات ہر کسی کو نصیب نہیں۔ غزل میں جو خوبیاں ہونی چاہیں عزیز کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ ایک طرف اربابِ ذوق لطفِ زبان اور فنِ کلام سے لطف اندوز ہوتے ہیں تو دوسری طرف نوآموز عزیز کے نقش قدم پر چل کر اعلیٰ درجہ کے شاعر ہو سکتے ہیں۔ میں آپ کے کلام کو ہمیشہ بہ نظرِ استفادہ دیکھتا ہوں''۔ (۱۴)

دبستان لکھنؤ میں اقبال سب سے زیادہ جن شعراء کی زبان سے متاثر تھے ان میں میر انیس سرفہرست ہیں۔ اقبال کا یہ خیال تھا کہ انیس نے اردو زبان کو حدِ کمال تک پہنچایا۔ لیکن ان کو اس کا ملال تھا کہ انیس کا سارا کمال صرف مرثیہ نگاری کی نذر ہو گیا۔

اقبال کے لڑکپن میں داغ اور امیر کا طوطی بول رہا تھا۔ داغ سے ان کی نسبت اور تعلق کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اور ہم یہ بھی اشارہ کر آئے ہیں کہ اقبال ابتدا ہی سے دبستانِ لکھنؤ اور خاص طور

پر امیر مینائی کی زبان سے متاثر ہونے لگے تھے۔ رفتہ رفتہ کلامِ امیر سے ان کی دل چسپی بڑھتی چلی گئی۔

احسن مارہروی، نواب مرزا خاں داغ کے شاگرد اور سکریٹری تھے۔ ۲۸ر فروری ۱۸۹۹ء کو انھوں نے اپنے کالج کے بورڈنگ ہاوس سے احسن مارہروی کے نام ایک خط لکھا جس میں اقبال نے ان سے فرمائش کی ہے کہ ''اگر آپ کے پاس حضرت مرزا داغ کی تصویر ہو تو ارسال فرمایئے..... حضرت امیر مینائی کی فوٹو کی بھی ضرورت ہے'' (۱۵) اس خط سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقبال داغ کے ساتھ ساتھ امیر مینائی کے کلام اور شخصیت سے دل چسپی لے رہے تھے بلکہ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اب ان کا شعری ذوق عالمگیر سطح پر پھیلنے لگا تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں ''میں نے تمام دنیا کے بڑے بڑے شاعروں کے فوٹو جمع کرنے شروع کیے ہیں۔ چنانچہ انگریزی، جرمنی اور فرنچ شعراء کے فوٹوز کے لیے امریکہ لکھا ہے''۔ (۱۶)

اِس وقت اقبال لاہور میں یم۔اے کے طالبِ علم تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ جب انھوں نے اردو زبان پر خاصہ عبور حاصل کرلیا تھا۔ اس وقت تک وہ غزل کے علاوہ کئی نظمیں قطعات، قطعاتِ تاریخ، مسدس اور مختصر مثنویاں لکھ چکے تھے۔ ان سب میں ان کا رنگ مختلف ہے۔ غزلوں میں اُن کی اسی نوعیت کی مشق جاری ہے جس میں زبان دانی اور صنائی کی کوششیں نمایاں ہیں اور ان کے اپنے حقیقی تجربے کی تپک برائے نام ہے۔ لیکن منظومات، مثنویات و قطعات میں وہ حقیقت نگاری کی طرف آگئے ہیں۔ کیونکہ یہ شاعری کسی مقصد کے تحت کی گئی تھی۔ لہٰذا ان میں اس دور کے دبستانِ علیگڈھ کے مقصد نگاروں کا خاص طور پر شبلی اور حالی کا اثر نمایاں ہے۔ نظم فلاح قوم یا ترقی و تعلیم جو فروری ۱۸۹۶ء کو انھوں نے لاہور میں ''انجمن کشمیری مسلمانان ہند'' کے اجلاس میں پڑھی اس میں قومی درد کے اظہار کے ساتھ ساتھ ایسے اشعار ملیں گے جو سرتاسر سادہ و سلیس ہیں۔ یہاں اس نظم کے چند منتخب اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

جو سامنے تھی مرے قوم کی بری حالت — اُمڈ گیا مری آنکھوں سے خون کا سیحوں
انھیں غموں میں مگر مجھکو اِک صدا آئی - کہ بیت قوم کی اصلاح سے ہوئی موزوں

ہزار شکر کہ ایک انجمن ہوئی قائم — یقیں ہے راہ پہ آئے گا طالع واژوں
خدا نے ہوش دیا متفق ہوے سارے — سمجھ گئے ہیں تری چال، گنبدِ گردوں
مزا تو جب ہے کہ ہم خود دکھائیں کچھ کر کے — جو مرد ہے نہیں ہوتا ہے غیر کا ممنوں
کچھ ان میں شوق ترقی کا حد سے بڑھ جائے — ہماری قوم پہ یارب وہ پھونک دے افسوں

(۱۷)

اس نظم میں اقبال نے مشکل قافیے کا انتخاب کیا ہے اور بات میں تاثیر پیدا کرنے کے لیے ایسے بہت سے اشعار کہے ہیں جن میں صرف گہرے جذبات کا اظہار ہے۔ جیسے

غم والم نے جگر میں لگا رکھی تھی اک آگ — بنا ہوا تھا مرا سینہ رشک صد کانوں
چلی نسیم یہ کیسی کہ پڑ گئی ٹھنڈک — چمن ہوئی مرے سینے میں نارِ سوزِ دروں

یہ اشعار مثالاً دیئے گئے ہیں جو اس نظم سے یہاں وہاں سے چُن لیے گئے ہیں۔ اس پوری نظم کے ہر شعر کا اگر مصرعۂ اول پڑھا جائے تو نہایت رواں اور سلیس ہے۔ دوسرا مصرعہ نامانوس قافیوں کی وجہ سے اکثر سُست ہوگیا ہے۔ اگر پہلے مصرعوں پر نظر ڈالی جائے، تو اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال صنّاعی سے ہٹ کر نہایت ہی صاف اور رواں زبان میں شعر کے ذریعہ اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کے قابل تھے۔ اوپر اشعار کا جو انتخاب دیا گیا ہے۔

اسی زمانے میں اقبال نے کشمیر سے متعلق نو قطعات لکھے ہیں۔ اِن میں جو بھی حقائق بیان کیے ہیں وہ نہایت لطیف طریقہ پر بیان کئے ہیں۔ زبان نہایت صاف اور دل کش ہے۔

کہکشاں میں آکے اختر مل گئے — اک لڑی میں آکے گوہر مل گئے
واہ وا کیا محفلِ احباب ہے — ہم وطن غربت میں آکر مل گئے (۱۸)

یاد رہے کہ یہ قطعات بھی انجمن کشمیری مسلمانانِ ہند لاہور میں پڑھے گئے تھے۔

موتی عدن سے لعل ہوا ہے یمن سے دور — یا نافۂ غزل ہوا ہے خُتن دور
ہندوستان میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر — بُلبُل نے آشیانہ بنایا چمن سے دور (۱۹)

ان اشعار کی صفائی سے جھلکتا ہے کہ ان پر میر انیسؔ اور امیرؔ مینائی کے مطالعے کا اثر ہے۔
۲۴ر فروری ۱۹۰۰ء کو اقبال نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے ایک اجلاس میں اپنی نظم ''نالۂ یتیم'' پڑھی۔ اس کی شکل مسدس کی ہے۔ اس کی بحر اور رنگ حالیؔ کی مسدس کا نہیں ہے بلکہ مسدس کے مصرعوں میں مضمون کی تکرار اور قافیہ نبھانے کے لیے قریبی مضمون کے مصرعوں کو جڑ دینے کا طریقہ عام ہے اس سے نظم میں روانی پیدا ہوتی ہے۔ ''نالۂ یتیم'' اقبال کی پہلی طویل، رواں اور موثر نظم ہے۔ اس کی زبان میں بناوٹ کی بجائے ایک فطری روانی ہے اور ابتداء سے انتہا تک نظم کی زبان اور اس کا مزاج ہموار ہے۔ اس میں عربی اور فارسی الفاظ کی زیادتی کی وجہ سے اس نظم کو کسی کلاسکی مکتب سے وابستہ کرنا کسی قدر مشکل ہے؟

۲۵ر مئی ۱۹۰۰ء کو اقبال نے منشی محبوب عالم کے سفرِ یورپ پر روانہ ہوتے وقت ایک الوداعی نظم ''خدا حافظ'' کہی اِس نظم کے دو بند ہیں اس میں کسی قدر غالب کے ایک قطعہ کا رنگ ہے

آپ ہیں محوِ سیرِ دریائی　　چشمِ احباب غم سے بھر آئی
دمِ رخصت وہ گرم جوشی ہے　　آتشِ عشق جس سے شرمائی
لب سے نکلا کہ فی امانِ اللہ　　فخر کرتی ہے تابِ گویائی
دوستوں کی رہے دعا حافظ　　ہو سفر میں ترا خدا حافظ (۲۰)

یہ نظم سادہ ہے اور اس کی زبان صاف ہے۔

۱۹۰۰ء میں رسالۂ معارف علیگڈھ میں اقبال کی ایک اور طویل نظم ''شمعِ ہستی'' شائع ہوئی۔ اس کی ہئیت دل چسپ ہے۔ ہے تو یہ مثنوی لیکن اس کی بحر ''فعل فعولن فعل فعولن'' ہے جو عام طور پر مثنوی کی بحر نہیں ہے یہ نظم غالباً مولانا حالی کی مثنوی کلمۃ الحق کی روشنی میں لکھی گئی ہے حالی نے یہ مثنوی ۱۸۸۳ء میں لکھی تھی جو کوئی (۱۲۰) اشعار پر مشتمل ہے۔ جس کا موضوع سچائی ہے اور بحر وہی ہے جس میں اقبال نے اپنی نظم ''شمعِ ہستی'' کہی ہے۔ گویا اس صنف میں روایت سے ہٹ کر پہلی کاوش حالیؔ کی ہے اقبال نے اپنی مثنوی کو کوئی سات حصوں میں بانٹ دیا ہے۔ ان

حصوں کو جدا کرنے کے لیے کوئی ایسا شعر یا طریقہ نہیں اختیار کیا گیا جس کی وجہ سے اسے ترکیب بند قرار دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ اختراعی روّیہ انگریزی ادبیات کے مطالعے کا نتیجہ ہے کہ ہئیت کی تشکیل خارجی طور پر قافیہ اور ردیف یا کسی بند کے ٹیپ سے نہ ہو بلکہ داخلی طور پر موضوع کے ابھرنے اور ترقی کرنے سے ہو۔ اس نظم میں نظریۂ ارتقاء پر مبنی خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہ نظم اقبال کی آگے تخلیق ہونے والی کئی اردو اور فارسی نظموں کا پیش خیمہ ہے۔ جیسے ''کنارِ راوی''، ''فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں'' اور ''روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے'' اور خاص طور پر ''ساقی نامہ'' اور فارسی کی نظم ''تسخیرِ فطرت''۔ یہ ایک جدا گفتگو ہے۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے اس میں اقبال نے نہایت ہی سہل اور بول چال کی زبان اختیار کی ہے اور ایسے محاورے باندھے ہیں جو ذیل کے مصرعوں سے واضح ہو سکتے ہیں۔ جیسے

اے شمعِ ہستی اے زندگانی بھاتی ہے دل کو تیری کہانی
ہے کوچ تیرا ہر لمحہ جاری جاتی ہے بگٹٹ تیری سواری
کیوں چُپ چپاتے ہر دم رواں ہے آئی کہاں سے جاتی کہاں ہے
فی الجملہ ہمت سب ہار بیٹھے ہیں سر بہ زانوں نا چار بیٹھے
پھولوں میں جھلکی تاروں میں چمکی بخشی جہاں کو رونق ارم کی
ہوتا نہ یاں جو تیرا ٹھکانہ چوپٹ ہی رہتا یہ کارخانہ
کیا پھونک ماری دنیا کے تن میں گویا لگادی' دون خشک بن میں
مٹی کا جو بن تو نے نکھارا دے دے کے چھینٹے اس کو نکھارا
تھی بھولی بھالی بھونڈی بے ہنگم تو نے سکھایا اس کو خم و چم
بھولی ہے اپنی اوقات پہلی پھرتی ہے خوش خوش وہ اہلی گہلی
کیا مال ہے جو تیرے سوا ہے تو ہی نہ ہو تو سب کچھ دُھتا ہے
اے سب کی پیاری سب کی چہیتی کچھ منہ زبانی' کچھ آپ بیتی

قدرت کے گھر کی میں لاڈلی ہوں　　ناز و نعم سے برسوں پلی ہوں
میری ادا پر مرتے تھے قدسی　　سجدے پہ سجدہ کرتے تھے قدسی
پھر دیش چھوٹا گزری سو جھیلی　　پردیسیوں کا اللہ بیلی
آب و ہوا میں دشت و جبل میں　　میری رسائی ہے ہر محل میں
جب آتے آتے سبزے میں آئی　　کروٹ بدل کر میں لہلہائی
انگڑائیاں لیں منہ کھول ڈالا　　پھر آنکھ سے کچھ دیکھا نہ بھالا
داخل ہوئی جب حیواں کے تن میں　　اک شور اٹھا اس انجمن میں
انسان کا جامہ جب میں نے پہنا　　اللہ رے میں! کیا میرا کہنا
کس کس جتن سے میں نے بنایا　　رتبہ بہ رتبہ پایہ بہ پایہ
جامد کو نامی ' نامی کو حیواں　　حیواں کو وحشی ' وحشی کو انساں
سنتے رہو گے میری کہانی　　جب تک ہے باقی دنیائے فانی (۸)

اقبال کے حقیقی افکار نے اپنے اظہار کا راستہ نظم میں نکالا اور اسی میں اپنے لیے ایک ایسی زبان پیدا کی جو نکسالی بھی ہو اور پہلی دفعہ غیر روایاتی مضامین کے اظہار کے لیے موزوں بھی ہو۔ اقبال کی یہ نظم کئی لحاظ سے قابلِ غور ہے۔

یہ ایک دل چسپ بات ہے کہ اقبال اس دور میں جو نظمیں لکھتے رہے' اُن کی زبان' فکر اور فنی رجحان اسی زمانے میں ان کی کہی ہوئی غزلوں سے بہت مختلف ہے۔ غزل میں ابھی تک وہ اپنے ذاتی تجربات اور احساسات کو پیش کرنے سے قاصر ہیں اور اس صنف میں ہنوز خیال آرائی' صناعی اور محاوروں کے استعمال کا رجحان نمایاں ہے۔

۱۸۹۵ء سے ۱۸۹۶ء کے دوران اقبال کی کہی ہوئی دو غزلیں اور ملتی ہیں پہلی غزل کے چند اشعار یہ ہیں۔

برسرِ زینت جو شمعِ محفلِ جانانہ ہے
شانہ اس کی زلف پیچاں کا پرِ پروانہ ہے

شکوۂ جور و جفا سے باز آجاتے ہیں ہم
کیوں صفِ محشر میں حالت تیری بے تابانہ ہے

کچھ خبر پوچھیں اسیرِ زلفِ پیچاں کی، مگر
سو زبانیں اسکی ہیں کیا اعتبار شانہ ہے

اللہ اللہ دیدۂ واعظ میں اڑ کر جا پڑی
پردہ دار مے کشاں خاکِ درِ مے خانہ ہے

میری باری پر گرا ہے دیکھ تو جذبِ شکست
ساقیا! توبہ سے پہلے ٹوٹتا پیمانہ ہے

رنگ لائی ہیں عبادت کا مری مے خواریاں
روکشِ سجدہ مری ہر لغزش مستانہ ہے

ہو گیا میری جبیں سے بت پرستی کا ظہور
خطِ پیشانی رگِ سنگ درِ مے خانہ ہے

دیکھ مغرب کی طرف سے جھومتا آتا ہے کیا
ساقیا! بادل نہیں اڑتا ہوا مے خانہ ہے

مے پرستی بھی نہاں ہے گردشِ تقدیر میں
خط پیشانی مرا گویا خطِ پیمانہ ہے

خانہ بربادی کے صدقے، سوئے صحرا جائیں کیوں
خیر سے گھر ہی ہمارا رشکِ صد ویرانہ ہے

سخت جاں شرمندۂ شوقِ شہادت کیوں نہ ہوں
تیغ میں بل پڑ گیا، قاتل کو دردِ شانہ ہے

ضعف کر دیتا مجھے شرمندۂ دشت جنوں
خانہ بربادی، مگر بولی "یہیں ویرانہ ہے

حضرت واعظ ہیں میخانے میں شاید آگئے
کلمۂ 'لاحول' وردِ ہر لبِ پیمانہ ہے

حضرت ناصح کو اس محفل میں لے جا کر کہا
ہاں بتا، اب میں ہوں دیوانہ کہ تو دیوانہ ہے

تیری محفل میں کبھی چلتا، کبھی رکتا ہے یہ
ذکر بھی، میرا، مگر میری طرح دیوانہ ہے

اس نے زانو بدلا تو تعظیم کو اُٹھنے لگا
تو بھی اے دردِ دلِ مضطر! کوئی دیوانہ ہے

شورشِ قالوا بلیٰ اٹھی جہاں صبحِ الست
دل اسی میخانے کا ٹوٹا ہوا پیمانہ ہے

اُڑ کے اے اقبال! سوئے بزمِ یثرب جائے گا
روح کا طائر عرب کی شمع کا پروانہ ہے (۲۲)

اس غزل میں بھی اس سے پہلے کہی ہوئی غزلوں کی طرح رعایتِ لفظی اور دیگر صنائع کا

رجحان ہے لیکن اب اس میں ایک پختگی آ گئی ہے اور اس کی زبان میں روانی ہے۔ اس غزل میں فارسی تراکیب زیادہ ہونے سے ان کا آہنگ کسی قدر گراں ہو گیا ہے۔ اب یہ تراکیب دیکھئے۔

برسرِ زینت' شانۂ زلفِ پیچاں' شکوۂ جور و جفا' صف محشر' اسیر زلف پیچاں' اعتبارِ شانہ' پردہ دار مے کشاں' روکشِ سجدہ' رگِ سنگِ در بت خانہ' خطِ پیشانی' شرمندۂ شوق شہادت۔

ان تراکیب کے درمیاں نہایت ہی خوبصورت محاورے ہیں لیکن دبے ہوئے سے ہیں دل چسپ بات یہ ہے کہ اس غزل کے ابتدائی دس گیارہ شعر تراکیب سے بوجھل اور سُست ہیں اور آخری چھ سات شعر با محاورہ زباں میں ہیں اور رواں ہیں۔

دوسری غزل کے منتخب اشعار یہ ہیں۔

تصور بھی جو بندھتا ہے تو خالِ روئے جاناں کا
بلندی پر ستارا ہے شب تاریک ہجراں کا

نقاہت قیس کی بولی' جو گزری پاس سے لیلیٰ
ذرا دامن بچانا' یہ بھی کانٹا ہے بیابان کا

جو ڈالی خاک مٹھی سے کہا نالوں نے چلّا کر
تجھے آتا نہیں سر پر اٹھالینا بیاباں کا

اڑا جب طائرِ رنگِ حنا لیلیٰ کے ہاتھوں سے
وہیں پھندا بنایا قیس نے تار گریباں کا

جنوں کو زخمِ دل کہتا ہے' قائل میں بھی ہوں تیرا
جو پھاہا بن کے آنکلے کوئی پرزہ گریباں کا

یہی کہتا ہے چاکِ دامنِ یوسف زلیخا کو
مجھے ٹانکا لگے تارنگاہِ پیر کنعاں کا

سمجھ کر اخترِ قسمت اٹھا لیتے ہیں ہم اس کو
ستارا جب گرا کوئی ترے ماتھے کی افشاں کا

جنوں! تیر نگاہِ یار نے چھلنی کیا سینہ
نہیں مشکل رہا اب چھاننا خاکِ بیاباں کا

کبھی تیر جنوں دل میں ترازو ہو ہی جائے گا
کبھی کام آہی جائے گا مرے کانٹا بیاباں کا

حیا مانع رہی لیکن اِدھر جذبِ محبت تھا
کسی نے اُٹھ کے آخر روزنِ دیوار سے جھانکا

دمِ زورِ جنوں آخر اسی سے سر پٹکتا ہوں
مرے سر پر بڑا احسان ہے دیوار زنداں کا

رقیبوں کو جلاتی ہے تمھیں بے تاب کرتی ہے
تمھیں کہہ دو اثر کیا کم ہے میری آہِ سوزاں کا

غضب ہوگا، کہیں اب وصل کا وعدہ نہ کر دینا — کہ خوگر ہو گیا ہوں میں شبِ تاریکِ ہجراں کا
برا ہو بدگمانی کا، اسی پر آنکھ رہتی ہے — نگہباں جانتے ہیں وہ مجھے اپنے نگہباں کا
بدل جائے اگر میرا مقدر اس کی قسمت سے — قدم آنے نہ دوں تیری گلی میں ایسے درباں کا
سمٹ کر تنگیِ دل سے، سویدا بن گیا آخر — خیال آیا اگر دل میں تری زلفِ پریشاں کا
مزا انکار میں ہے وصل کے اقرار سے بڑھ کر — کرشمہ ہے یہ سب شیرینی تقریرِ جاناں کا
ہماری شوربختی کا اثر اتنا تو ہو یارب — نہ ہو زخمِ جگر محتاج قاتل کے نمک داں کا

نسیمؔ و تشنہؔ ہی اقبال کچھ نازاں نہیں اس پر
مجھے بھی فخر ہے شاگردیِ داغؔ سخنداں کا (۲۳)

اس غزل میں اقبال نے اپنے خیال میں داغؔ کی اتباع کی ہے اور یقیناً کی ہے۔ مگر شاید اس وقت وہ غالبؔ کو بھی ذوق وشوق سے پڑھ رہے تھے کیونکہ اس غزل پر غالب کا اثر بھی صاف جھلکا پڑتا ہے۔ خیر جو کچھ ہو۔ اس غزل میں بھی اگر چہ مضامین خیالی ہیں لیکن زبان بڑی با محاورہ ہے، محترک ہے اور رواں ہے۔ متحرک اس لیے کہ اشعار میں افعال کا استعمال خوب ہے اور تراکیب کی جگہ محاوروں نے لے لی ہے۔ ذرا یہ محاورے ملاحظہ ہوں۔

تصور بندھنا، ستارے کا بلندی پر ہونا، دامن بچانا، مٹھی بھر خاک ڈالنا، سر پر اٹھا لینا رنگ اُڑنا، پھندہ بنانا، پھاہا بن جانا، ٹانکا لگنا، سینہ چھلنی کرنا، خاک چھاننا، تیر کا ترازو ہو جانا، کام آجانا، حیا کا مانع رہنا، روزنِ دیوار سے جھانکنا، سر پٹکنا، سر پر احسان ہونا، کسی کو جلانا، بے تاب کرنا، غضب ہو جانا، کسی کا برا ہونا، کسی چیز پر آنکھ رہنا، کسی کا قدم آنے نہ دینا، وغیرہ۔

اس غزل کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال اردو زبان سیکھنے اور شاعری میں آگے بڑھنے کے لیے جس تندہی سے لگے تھے اس میں وہ آگے بڑھ رہے ہیں اور ان کی زبان پر کئی اساتذہ کا اثر ہے۔ خود یہ غزل اگر چہ داغؔ کی پیروی میں کہی ہوئی ہے لیکن اس میں بھی لکھنؤ کا اثر یہاں وہاں موجود ہے اور کیوں نہ ہو یہ غزل مشاعرے کے لیے کہی گئی تھی جس میں مصرعۂ طرح ناسخؔ کا یہ مصرعہ تھا۔

''مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا''

اس کے بعد ۱۹۰۰ء تک کا جو کلام ہے اس میں چند تبدیلیاں نمایاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ نظم ہو یا غزل اس میں عاشقانہ کیفیت چھائی ہوئی ہے اور خیال آرائی کی جگہ اُن کا اپنا ذاتی اور نفسی تجربہ لے رہا ہے۔ ساتھ ساتھ صنائع اور فارسی تراکیب کم سے کم ہوتی جارہی ہیں۔ زبان اور خیال پر لکھنؤ کا اثر خاص کر آتش کا اثر نمایاں ہے۔ غزل اور نظم دونوں میں خیال اور تجربے کی وحدت اس طرح کارفرما ہے کہ غزل میں نظم کی سی کیفیت ہے اور نظم غزل نما ہے۔ یہاں ان کی ایک غزل اور ایک نظم ''عیش جوانی'' کے کچھ اشعار پیش کیے جاتے ہیں کہ ان سے مذکورہ بالا تبدیلی کا اندازہ ہو سکے۔

غزل

تم نے آغازِ محبت میں یہ سوچا ہو گا — کس طرح کا یہ نیا چاہنے والا ہوگا
تم نے سمجھا تو ہے اس گھر کو ہمارا لیکن — اب ہمارا ہے کوئی دن میں تمھارا ہوگا
نامہ بر کام تو باتوں میں ہوا کرتے ہیں — مان جائیں گے اگر تجھ کو سلیقہ ہو گا
ہاں سنا پہلے ہمیں، ان کو کہے گا کیا کیا — نامہ بر ہم جو بتائیں وہی کہنا ہو گا
ہم کہیں جائیں کسی کام کو جائیں لیکن — دل یہ کہتا ہے اسی رہ سے گزرنا ہوگا
تیرے اشعار میں اقبالؔ یہ رنگت تو نہیں — تو نے کمبخت کسی شوخ کو تاکا ہوگا (۲۴)

اس کے بعد ان کی نظم ''عیش جوانی'' کے اشعار قابلِ توجہ ہیں ابھی اقبال کی عمر ۲۲۔۲۳ سال ہے لیکن اپنی جوانی کے قصے کو شبابِ رفتہ کا قصہ بناتے ہیں۔ جس کا مقصد صرف ایک طرح کی پردہ داری ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں (۲۵)

اے شبابِ رفتہ اے آرامِ جانِ بیقرار — کتنے دلکش آہ ظالم تھے ترے لیل و نہار
دل میں ارمانوں کا وہ مجموعہ وہ بزمِ آرزو — وہ تپاکِ قلب سے اُف اُف زباں پر بار بار

وہ محبت کے مزے وہ لطفِ شب ہائے وصال
چاندنی راتوں کا وہ منظر وہ پھولوں کی بہار

بام پر اک ماہ سیما سے وہ سامانِ وصال
اِک پری وش سے وہ ذوق لذت بوس و کنار

ہلکا ہلکا اک دوپٹہ صندلی زیب بدن
دوشِ نازک پر نزاکت سے وہ آنچل ناگوار

نیچی نیچی آہ وہ نظریں وہ اندازِ حجاب
نرگسِ مستانہ میں وہ سرمۂ دمبالہ دار

نشۂ جوشِ جوانی کی وہ مستانہ اُمنگ
جس طرح ہو کوئی سرمستِ ادامستِ خمار

ہائے وہ اُلھڑ پنے کے دن جوانی کا وہ سن
عنفوانِ حسن کا کم کم وہ سینے کا اُبھار

بام میں وہ چاندنی میں شب کو خلوت کے مزے
لطفِ یکجائی کا ساماں لذتِ بوس و کنار

ضد ہم آغوشی شوقِ نیم جامہ کو اِدھر
اور ادھر محوِ تغافل نازِ حسنِ پردہ دار

وصل میں لب پر ادھر عذرِ نزاکت کا گلہ
اضطراب دل سے یاں شکوہ زباں پر بار بار

وہ تبسم ہائے پنہاں وہ نگاہِ شرمگیں
نیچی نظروں سے چرالینا وہ دل بے اختیار

ہائے وہ شب بھر شراب وصل کی سرمستیاں
صبح کو آنکھوں میں کم کم خوابِ نوشیں کا خمار

آہ وہ جھینپی ہوئی نظریں وہ شرمیلی ادا
شب کی کیفیت کا جن سے رازِ پنہاں آشکار

اس نظم میں آتش سے لے کر امیر تک کا لکھنوی اثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اگر اقبال صرف اس رنگ میں بھی شعر کہتے رہتے تب بھی ہندوستان میں بہت مقبول ہوتے۔ لیکن اقبال کے پیش نظر ابتدا ہی سے کچھ اعلیٰ مقاصد تھے۔ یہ ساری شاعری تو دیوارِ دبستاں پر مجنوں کے لام الف لکھنے کے مرادف ہے۔ حقیقی معنوں میں یہ ان کی مشق سخن ہے جس کے ذریعہ انھوں نے فن شاعری پر عبور حاصل کیا اور اس سے کہیں مشکل چیز شعری زبان پر دستگاہ حاصل کی۔ یہ ان کی ہمت تھی کہ اب تک اس گفتگو میں ہم نے جتنے اشعار پیش کیے ہیں اقبال نے ان سب کو منسوخ کر دیا۔ انکا منسوخ شدہ کلام ان کی زبان اور فن کے ارتقاء کو سمجھنے میں بہت مدد دیتا ہے اور اس لحاظ سے بہت اہم ہے۔ اقبال نے اپنے آخری زمانے تک کے کلام کے بعض حصے منسوخ کیے ہیں۔ ہم نے صرف ابتداء سے ۱۹۰۰ء یا ۱۹۰۱ء تک کے منسوخ شدہ کلام کو پیش نظر رکھا ہے تا کہ ان کی زبان

آموزی کا جائزہ لیا جا سکے۔ ورنہ اس دفتر میں سوچنے کے لیے اور بہت کچھ ہے۔

۱۸۹۹ء میں اقبال نے فلسفہ میں یم۔اے کر لیا تھا۔ اس وقت تک اردو اور فارسی زبانوں پر ان کو قدرت حاصل ہو گئی تھی۔ وہ دہلی اور لکھنؤ کے دبستانوں کے مزاج شناس ہو چکے تھے اور دونوں کی اتباع میں شعر کہنے کے قابل تھے۔ اس کے علاوہ مجموعی طور پر ان کا لسانی شعور اور مطالعہ وسیع ہو چکا تھا۔ اسی زمانے میں ایک برطانوی ماہر السنہ ڈاکٹر وائٹ بریچنٹ کے مضمون ''زبان اردو'' کا انھوں نے اردو میں ترجمہ کیا جو رسالۂ مخزن ستمبر ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا۔ اس میں جس لسانی شعور کا اظہار ہے اس زمانے کے شاعر اور ادیب اس سے بڑی حد تک بے خبر تھے۔ اس زمانے تک زبانِ لکھنؤ سے ان کی دل چسپی بہت بڑھ گئی تھی۔ آتش، ناسخ، انیس، امیر مینائی، اسیر، جلال سے لے کر عزیز لکھنوی تک کے کلام کا انھوں نے خوب مطالعہ کیا اور امیر مینائی کے کلام اور شخصیت سے بے انتہا متاثر رہے۔

امیر کے انتقال پر اقبال کو بڑی فکر ہوئی کہ امیر مینائی کی سوانح عمری مرتب کریں اور ان کی شاعری پر بحث کرتے ہوئے ان پر انگریزی میں ایک مضمون لکھیں اور ولایت کے کسی مشہور اخبار یا رسالے میں چھپوائیں۔ اس سلسلے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے انھوں نے حضرت امیر کے کئی شاگردوں کو ایک سوال بند کے ساتھ خطوط لکھے۔ امیر جیسے ''صاحب کمال'' کی سوانح عمری کے نہ لکھے جانے کا اقبال کو بڑا افسوس تھا۔ امیر مینائی کے انتقال کے بعد جب کہ داغ ابھی زندہ تھے اقبال منشی محمد الدین فوق کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں

> ''حضرت امیر کے کلام کا مطالعہ کرنے والوں سے مخفی نہیں کہ وہ صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ ان کا درجہ شاعری سے بہت بڑھا ہوا تھا۔ ان کے کلام میں ایک خاص قسم کا درد اور ایک خاص قسم کی لَے پائی جاتی ہے، جو صاحب دلوں کو بے چین کر دیتی ہے اور وہ کلیجہ پکڑ کر رہ جاتے ہیں۔ آہ! ایسے بے نظیر شخص کے حالات، جو اصلی معنوں میں تلمیذ الرحمٰن کہلانے کا مستحق ہو ابھی تک گمنامی میں پڑے ہیں، اندھیر نہیں تو اور کیا ہے؟ اگر یہی شخص یورپ یا امریکہ میں ہوتا تو اس کی زندگی میں اس کی کئی سوانح عمریاں نکل

جاتیں۔ مگر افسوس ہے ہندوستان میں ان کی زندگی میں تو درکنار ان کی وفات کے بعد بھی ان کی کوئی لائف نہ لکھی گئی۔ میرا ایک عرصے سے خیال تھا کہ حضرت امیرؔ کی زندگی کے جستہ جستہ واقعات قلم بند کروں، مگر اب مرحوم کی لائف کے متعلق ایک تازہ مضمون دیکھ کر پھر امنگ آئی ہے کہ جس طرح بھی ہو میں اپنے کام کو پورا کروں اور بہت جلد''

امیر مینائی اور دبستان لکھنؤ سے اقبال کا لگاؤ بڑھتا گیا یقیناً ان کے یہاں بعض بنیادی دہلوی رجحانات ہیں جو ان کی نثر نگاری سے ظاہر ہوتے ہیں جیسے مصدر کی تانیث کہ ''مجھے یہ بات کہنی تھی'' وغیرہ لیکن شاعری میں ان کا غالب رجحان دبستان لکھنو ہی کی طرف دکھائی دیتا ہے۔ ۱۹۰۰ء کے بعد سے اقبال کو فنِ شعر اور اپنی زبان دانی دونوں پر اعتماد حاصل ہو چکا تھا۔ چنانچہ اسی دور سے انھوں نے اپنے کلام کو ''بانگ درا'' میں شامل کیا۔ بانگ درا کی بیشتر نظموں کا اسلوب غزل کا سا ہے۔ جس میں فارسی تراکیب کی وجہ سے غالب کے اثر کا گمان ہوتا ہے۔ اور جہاں فارسی اثر بڑھا ہے وہاں فعل کا استعمال کم ہو گیا ہے۔ نظم ''ہمالہ'' اس کی دل چسپ مثال ہے جس کے کسی مصرعے میں ایک سے زیادہ فعل نہیں ہے اور بعض مصرعوں میں تو فعل ہے ہی نہیں۔ یہی حال ''گلِ رنگیں''، ''مرزا غالب'' جیسی نظموں کا ہے۔ لیکن انھوں نے انگریزی ادب سے ماخوذ بچوں کے لیے جو نظمیں لکھیں ہیں وہ فارسی تراکیب سے بوجھل نہیں ہیں۔ ان میں افعال زیادہ ہیں اور بیان متحرک ہے۔ ''ایک مکڑا اور مکھی''، ''ایک پہاڑ اور گلہری'' وغیرہ ساری نظمیں اسی کیفیت کی حامل ہیں۔ اس کے بعد اقبال کا وہ کلام ہے جو انھوں نے یورپ میں لکھا۔ اس میں لسانی تبدیلیوں سے زیادہ فکری تبدیلیاں ہیں۔ جن کا جائزہ ایک علیحدہ کام ہے۔ زبان کے لحاظ سے اقبال کی جو زبان ۱۹۰۰ء تک بن چکی تھی اب وہی ایک پختہ شکل اختیار کر رہی تھی۔ بانگِ درا کا حصہ دوم ۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء جو زیادہ تر یورپ میں لکھا گیا ایسی ہی زبان کی نمائندگی کرتا ہے۔

۱۹۰۸ء میں جب اقبال ہندوستان واپس آئے تو اُس وقت ان کا میلان زیادہ اردو تر نظم گوئی کی طرف تھا اور اردو کے شعری سرمائے کے مطالعہ کا سلسلہ جاری تھا۔ غالباً اس وقت انھیں ایک ایسی نظم کہنے کا خیال آیا جسے کہہ کر وہ سارے ہندوستان کو چونکا سکیں۔ یا ممکن ہے کہ یہ خواہش ان کے تحت الشعور میں ہو اور کسی واقعے نے ان کی رہنمائی کی ہو اور ایسی نظم کہنے کا راستہ سجھایا ہو۔

انیسویں صدی کے آواخر میں واسوخت لکھنے کا ایک سلسلہ چل پڑا تھا۔ خاص طور پر حضرت امیؔر مینائی کے واسوخت بہت مقبول ہو رہے تھے۔ امیؔر مینائی نے کم از کم سات واسوخت لکھے ہیں جو مسدس کی شکل میں ہیں۔ ان کے سارے واسوخت کوئی پانچ سو بند پر مشتمل ہیں۔ اس میں چھ واسوخت اس بحر میں ہیں جس میں اقبال کا شکوہ اور جوابِ شکوہ ہے۔ ظاہر ہے واسوخت ایک ایسی نظم ہوتی ہے جس میں عاشق معشوق کی بے وفائی' تغافل اور ظلم سے تنگ آ کر برگشتہ ہو جاتا ہے اور جلی کٹی سنانے لگتا ہے۔ امیؔر کے ساتوں واسوخت اسی مضمون پر مبنی ہیں جس میں اپنی وفا اور معشوق کی بے وفائی کا ذکر ہے۔ پھر اس سے تنگ آ کر اس سے بہتر معشوق کے ساتھ ہو جانے کی دھمکی ہے۔ پھر خلوت اور اختلاط کے نہایت عریاں مناظر ہیں۔ ظاہر ہے کہ واسوختوں کے جو کردار ہیں وہ شاہدانِ بازاری ہیں جن سے سمجھوتا ہو جاتا ہے اور وصل کی نوبت آتی ہے یہ بند ملاحظہ ہوں۔

دل ملا آنکھیں لڑیں بات کی لذت اُٹھی　　دیر تک حرف و حکایات کی لذت اُٹھی
رفتہ رفتہ یہ مدارات کی لذت اُٹھی　　ہم نشینی سے ملاقات کی لذت اُٹھی
شانۂ زلف بنا پنجۂ مژگاں میرا
دستِ شوق اُس کا ہوا طوقِ گریباں میرا

اس گلِ تازہ سے میں' مجھ سے وہ گلرو لپٹا　　میں گلے سے میرے ساعد سے وہ بازو لپٹا
عشق پیچے کی طرح پا کے جو قابو لپٹا　　ہار بن کر مری گردن سے وہ گیسو لپٹا
منہ سے منہ ملنے لگا سینے سے سینہ کیا کیا
عطر ملنے لگا کپڑوں میں پسینہ کیا کیا

کم نہ تھی اس کی جوانی سے جوانی میری　　وہ جو افسانہ تو مشہور کہانی میری
اُس طرف اس کی اِدھر سحر بیانی میری　　جو کہا اس نے زباں سے وہ زبانی میری

اس کے سینے نے ادھر اس کو ابھارا کیا کیا
جال مجھ پر مری بے تابی نے مارا کیا کیا (۲۷)

ان اشعار سے واسوخت کے عریاں پہلوؤں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ باقی جو جلی کٹی ہے سو وہ تو ہے ہی۔ اقبال نے انگلستان سے واپسی پر امیرؔ مینائی کے واسوختوں کا مطالعہ کیا۔ ان کا ایک واسوخت جوان کی زندگی میں چھپنے سے رہ گیا تھا وہ غالباً اسی زمانے میں چھپا اور یقیناً اقبال کی نظر سے گزرا اور اقبال کو یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ صنف جو شاہدانِ بازاری سے شکوہ اور شکایت کے لیے برتی گئی ہے کیوں نہ اُسے خدا سے شکایت کے لیے استعمال کیا جائے یہ خیال اقبال کی افتادِ طبع سے فطری مناسبت بھی رکھتا تھا اور ندرت بھی۔ اس سے وہ ایک نہایت چونکا دینے والی نظم کہہ سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اُسی سانچے پر اپنی دونوں نظمیں ''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ'' لکھیں جنھوں نے ہندوستان بھر میں اردو پڑھنے والوں میں ہل چل مچادی۔ امیرؔ مینائی کی واسوخت اور اقبال کے شکوہ اور جوابِ شکوہ میں موضوع کا فرق یقیناً زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ اسی لیے ان نظموں کے ماخذ کے طرف ناقدینِ اقبال کی توجہ کم ہوگئی۔ یہاں امیرؔ مینائی کے واسوختوں سے کچھ اشعار نقل کیے جاتے ہیں تاکہ اندازہ ہو سکے کہ اقبال نے ان سے کتنا اور کس طرح اکتساب کیا ہے۔

ساکنِ دیر و حرم کوچہ میں اس کے ہیں مکیں　　کون ہے نذر جو کرتا نہیں اس کو دل و دیں
بندۂ عشقِ مجازی ہیں تمام اہلِ یقیں　　اپنے مذہب کا کسی قوم کو اب پاس نہیں
شیخ سے جو دہ کہے تارکِ ایماں ہو جائے
برہمن ایک اشارے میں مسلماں ہو جائے

غم میں ڈوبا وہ کیا جس سے کنارہ اس نے　　دل کیا نذر، کیا جس کو اشارہ اس نے
تیغ کی گھاٹ ہزاروں کو اتارا اس نے　　سینکڑوں کو نگہ ناز سے مارا اس نے
تیغ ہے ابروئے پُر خَم تو مژہ تیر بھی ہے
قدر انداز بھی ہے صاحبِ شمشیر بھی ہے

بدر پیشانی کو دیکھے تو جھکے سر بسجود　　کہکشاں کو فقط ہی مانگ کی نسبت سے نمود
خالِ ہندو کا ہوا گلشنِ عارض درود　　سونگھ کر بو پڑھے مومن کی طرح کیوں نہ درود

تل سیہ روئے کتابی پہ نمایاں دیکھو
طفلِ ہندو بھی ہوا حافظِ قرآن دیکھو (۲۸)

ایک اور واسوخت جو بہت بعد میں شائع ہوئی اس کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں

ہم سے وہ لطف وہ الفت وہ مدارات نہیں　　بات کیسی کہ کبھی نام کو وہ بات نہیں
پہروں خاموش کبھی حرف و حکایات نہیں　　وصل کی رات کہاں دن کو ملاقات نہیں

گر کبھی کہیے کہ منظور ہے آرام کہاں
ہنس کے کہتے ہو کہ ''آرام کا ہنگام کہاں''

دل میں اپنے تو ذرا سوچ تو اے ظلم شعار　　ہم سزاوار اسی کے تھے کہ ہوں سینہ فگار
جو کہا تو نے کیا ' اپنا لٹا یا گھر بار　　سر کبھی تیری اطاعت سے نہ پھیرا زنہار

ہے یہ کس جرم کی تعزیر گنہگار نہ تھے
ہم تو اس خانہ خرابی کے سزاوار نہ تھے

عاشقِ زار پہ یہ جور و جفا کیوں صاحب　　یہی ہوتی ہے رہ و رسمِ وفا کیوں صاحب
زہر ہم کو عوضِ آبِ بقا کیوں صاحب　　یوں ہی بیمار کی کرتے ہیں دوا کیوں صاحب

کوئی راحت نہیں ایذا سے سوا ملتی ہے
دل لگانے کی یہ عاشق کو سزا ملتی ہے

شہرتیں تھیں گل رخسار کی گلزاروں میں　　آئینہ نورِ جبیں آئینہ رخساروں میں
تذکرے حسن کے تھے سارے طرحداروں میں　　تھے جو یوسف وہ خریدار تھے بازاروں میں

آفتِ جانِ جہاں کون نظارہ نہ ہوا
کون محفل تھی جہاں ذکر ہمارا نہ ہوا (۲۹)

اس طرح امیر مینائی کی واسوختوں میں ایسے اور کئی بند نکل آئیں گے جن کو پڑھنے سے اقبال کے ''شکوہ'' اور ''جوابِ شکوہ'' کے شعر یاد آنے لگتے ہیں۔ یہ اقبال کی ندرتِ فکر اور مضامین کی بلندی ہے جس نے روایتی واسوخت کا مزا پھیکا کر کے رکھ دیا۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں ہوسکتا کہ دبستانِ لکھنؤ کے مضامین کتنے ہی مبتذل کیوں نہ ہوں اس کی زبان کا حسن اور بانکپن اعلیٰ ترین خیالات کے ابلاغ کی صلاحیت رکھتا تھا۔ شعری زبان کے اس راز کو اقبال نے خوب سمجھا۔ دبستانِ لکھنؤ کی یہ اتباع اقبال کے یہاں روز افزوں اور آخر تک ہے۔ لیکن اقبال کبھی اردو اور کبھی فارسی میں شعر کہتے رہے اور ان دونوں زبانوں میں کہے ہوئے کلام کو بلحاظ مقدار دیکھا جائے تو اقبال نے اردو کی نسبت فارسی میں زیادہ کہا ہے۔ اس کا اثر ان کی اردو زبان پر کئی طرح پڑا ہے جس کا ذکر آگے کیا جائے گا۔ جہاں تک اتباع زبان لکھنؤ کا تعلق ہے ان کی کئی شہکار نظمیں اس کی شہادت دیتی ہیں۔ حتیٰ کہ جب وہ انگلستان میں تھے اس وقت بھی ان کی نظمیں ''چاند اور تارے''، ''انسان''، ''تنہائی''، ''ایک شام'' کی منظر نگاری میں وہی آہنگ ہے جو دیا شنکر نسیم کی مثنوی گلزارِ نسیم کا ہے۔ گلزارِ نسیم کے یہ اشعار دیکھیے۔

لفظوں سے قلم کی مہرہ بازی — یوں لاتی ہے رنگِ بد طرازی
یک چند پھرا کیا وہ انبوہ — صحرا صحرا کوہ در کوہ
بلبل ہوے سب ہزار جی سے — گل کا نہ پتہ لگا کسی سے
وارد ہوے اک جگہ سرِ شام — فردوس تھا اس مقام کا نام

اور اقبال کے اشعار ملاحظہ ہوں

ڈرتے ڈرتے دمِ سحر سے — تارے کہنے لگے قمر سے

نظارے رہے وہی فلک پر ہم تھک بھی گئے چمک چمک کر

(چانداورتارے)

قدرت کا عجیب یہ ستم ہے

انساں کو راز جو بنایا راز اس کی نگاہ سے چھپایا
بے تاب ہے ذوق آگہی کا کھلتا نہیں بھید زندگی کا
حیرت آغاز و انتہا ہے
آئینہ کے گھر میں اور کیا ہے (انسان)

خاموش ہے چاندنی قمر کی شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کا نوافروش خاموش کہسار کے سبز پوش خاموش
فطرت بے ہوش ہو گئی ہے آغوش میں شب کے سوگئی ہے
(ایک شام)

تنہائی شب میں ہے حزیں کیا انجم نہیں تیرے ہم نشین کیا
یہ رفعتِ آسمانِ خاموش خوابیدہ زمیں، جہانِ خاموش
یہ چاند یہ دشت و در یہ کہسار فطرت ہے تمام نسترن زار
(تنہائی)

آتش کی غزل کے اشعار ہیں

کج رکھ نہ پاکو جادے سے غافل پھیر اس نے کھایا جو راہ بھولا
خُر نے گرایا اس کو نظر سے جو ذرہ تیری درگاہ بھولا
دیکھے سے تیرا روئے منور ہم مہر بھولا ہم ماہ بھولا

اب اقبال کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں

کیا چرخِ کج رو کیا مہر کیا ماہ　　سب راہرو ہیں و اماندہِ راہ
حاجت سے مجبور مردانِ آزاد　　کرتی ہے حاجت شیروں کو روباہ
ہر شے مسافر ہر چیز راہی　　کیا چاند تارے کیا مرغ و ماہی

اقبال کی منظومات میں ''ساقی نامہ'' ایک غیر معمولی نظم ہے۔ یہ میر حسن کی ''مثنویٔ سحر البیان'' کے انداز میں ہے۔ سحر البیان کی بحر وہی ہے جو فردوسی کے شاہنامہ کی ہے۔ اس بحر کی روانی اور مثنوی سحر البیان میں افعال کی فراوانی نے یقیناً اقبال کی طبیعت میں تحریک پیدا کی ہوگی۔ مثنوی کے مضامین حسبِ روایت مجازی اور کہیں کہیں مبتذل نہ سہی عریاں ہیں یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

پلا ساقی ایک جام مجھ کو شتاب　　کہ پردے میں شب کے گیا آفتاب
گری جب چھپر کھٹ میں وہ رشکِ حور　　سبھوں کو کہا تم رہو دور دور
اکیلی وہ روتی تھی زار و نزار　　اسی اپنے عالم میں بے اختیار
صبوحی تو دے ساقیٔ لالہ فام　　کہ رو دھو کے میں رات کاٹی تمام
دکھادے کوئی گوکھرو مُوڑ مُوڑ　　کہیں سوت بوٹی کہیں تار توڑ
مُعلّم اتالیق منشی ادیب　　ہر اک فن کے استاد بیٹھے قریب

ساقی نامہ کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں

ہوا خیمہ زن کاروان بہار　　اِرم بن گیا دامنِ کوہسار
گل و نرگس و سوسن و نسترن　　شہیدِ ازل لالہ خونی کفن
ہوا نیلی نیلی فضا میں سرور　　ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور
وہ جوئے کو ہستاں اُچکتی ہوئی　　اٹکتی لچکتی سرکتی ہوئی

ذرا دیکھ اے ساقیٔ لالہ فام　　سناتی ہے یہ زندگی کا پیام
پلادے مجھے وہ مئے پردہ سوز　　کہ آتی نہیں فصلِ گل روز روز
تمدّن تصوّف شریعت کلام　　بتانِ عجم کے پجاری تمام

ساقی نامہ کا اسلوب و آہنگ سحر البیان سے اخذ کیا گیا ہے۔ لیکن اقبال اس کو ایک اور فضا میں لے جاتے ہیں جس میں زندگی اور اس کے ارتقاء کے مختلف مناظر دکھاتے ہوئے سرمایہ داری اور محنت کش طبقے کی کشمکش کے مسائل، اسلامی فکر کے ارتقاء اور اسی طرح کے فلسفیانہ و روحانی مسائل چھیڑتے ہیں۔ اقبال نے کہاں کا مسالہ کہاں استعمال کیا۔ ساقی نامہ اردو زبان کی ایک اہم ترین نظم ہے۔

انیسویں صدی میں خاص طور پر غدر کے بعد ہندوستان کی جو تھکی ہاری فضا تھی اس کی تلخی کو مٹانے کے لیے شاعروں نے رنگین گوئی شروع کر دی تھی۔ داغؔ اور امیرؔ کی شاعری اس کی سب سے نمایاں مثالیں ہیں۔ ان کی جو شاعری مشہور و مقبول ہوئی وہ مجازی اور جسمانی ہے۔ اس میں معاملے کی شوخیوں کے علاوہ جگہ جگہ شہوانیت ہے۔ اس کی مثالیں اوپر دی جا چکی ہیں۔ اقبال زبان آموزی اور اکتسابِ فن کی خاطر اس راستے سے بھی گزرے۔ انھوں نے نہایت دقیقہ سنجی سے اس کلام کا مطالعہ کیا اور ابتداء میں اسی رنگ میں لکھا بھی نیز اپنی شاعری کے ابتدائی پانچ سات برس میں اقبال نہ صرف زبان دہلی و لکھنؤ سے آشنا ہو گئے تھے بلکہ زبان لکھنؤ کے دلدادہ اور متبع ہو گئے۔ اور دس برس کے اندر ان کو زبان اور فن پر قابلِ اعتماد دستگاہ حاصل ہو گئی۔ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ ساتھ ساتھ وہ فارسی زبان میں بھی شعر کہتے رہے اور بین الاقوامی زبان کا مطالعہ بھی کرتے رہے۔ اقبال نے شعر و زبان کو کبھی مقصود بذات نہیں سمجھا۔ وہ اس کو ہمیشہ اپنی پیام رسانی کا وسیلہ سمجھتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں باوجود صاحبِ کمال ہونے کے زبان دانی کا کبھی دعویٰ نہیں رہا۔ اقبال کے یہاں ایک شعر ایسا نہیں ہے جو تعلّی پر مبنی ہو۔ جب کہ اردو اور فارسی زبان کا شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس نے اپنی زبان دانی کا دعویٰ اور اس معاملے میں تعلّی نہ کی ہو۔ اگر اقبال کی زبان پر کسی نے انھیں ٹوکا بھی اُنھیں تو وہ نہایت انکساری کے ساتھ اس کا

مدلل جواب دیتے تھے۔ان کا ایک مضمون ''اردو زبان پنجاب میں'' جو ۱۹۰۲ء میں لکھا گیا' جب اقبال کی عمر ۲۴۔۲۵ برس تھی' ان کے اس مُدبّرانہ مزاج اور منکسرانہ رویّے کا شاہد ہے۔(۳۰)

اودھ پنچ نے اقبال کے کلام پر مسلسل اعتراضات شائع کرنا شروع کیے۔اقبال کو جب اُن کی اشاعت کا علم ہوتا تو وہ ان پرچوں کے متلاشی ہوتے تا کہ ان اعتراضات کی روشنی میں اپنی غلطیوں کو سمجھ سکیں۔محمد الدین فوقؔ کے نام ۶/ مارچ ۱۹۱۷ء کو وہ لکھتے ہیں:

> ''اودھ پنچ نے جو اعتراضات مجھ پر کیے ہیں ان کا مجھے علم نہیں۔وہ پرچہ تلاش کرنا چاہیے۔ممکن ہے کہ ان اعتراضوں میں کوئی کام کی بات ہو۔لکھنؤ والے یا اور معترض یہ خیال کرتے ہیں کہ اقبال شاعر ہے مگر میری غرض شاعری سے زبان دانی کا اظہار یا مضمون آفرینی نہیں' نہ میں نے آج تک اپنے آپ کو شاعر سمجھا ہے۔حقیقت میں فن شاعری اس قدر دقیق اور مشکل ہے کہ ایک عمر میں بھی انسان اس پر حاوی نہیں ہوسکتا۔ پھر میں کیوں کر کامیاب ہوسکتا ہوں جسے روزی کے دھندے سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ میرا مقصود گاہ گاہ لکھنے سے صرف اسی قدر ہے کہ چند مطالب جو میرے ذہن میں ہیں ان کو مسلمانوں تک پہنچادوں اور بس۔''(۳۱)

مولانا گرامی کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

> ''شاعری محض محاورات اور اظہار بیان کی صحت سے بڑھ کر کچھ اور بھی ہے۔ میرے معیار تنقید نگاروں کے ادبی معیاروں سے مختلف ہیں۔میرے نزدیک شاعری محض ایک ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔''(۳۲)

اقبال نے چونکہ زبان کو ثانوی حیثیت دی تھی اور پیام کو اولین' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اقبال کے ناقدین نے بھی یہی رویّہ اختیار کیا اور اقبال کی زبان کی قدر و منزلت کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔اس میں شک نہیں کہ اقبال کے یہاں کچھ غلطیاں بھی ہیں لیکن کس استاد کے پاس غلطیاں نہیں ملتیں۔

۱۹۰۵ء تک اقبال نے اردو' فارسی اور انگریزی تینوں زبانوں میں اس قدر دستگاہ حاصل

کر لی تھی کہ ان زبانوں میں وہ بے تکلف اپنے خیالات اور جذبات کا تخلیقی اظہار کر سکتے تھے۔ خالص فلسفیانہ خیالات کے لیے انھوں نے انگریزی کا انتخاب کیا اور شاعری کے لیے اردو اور فارسی کا۔ ان دونوں زبانوں میں اب ان کا مقام استادانہ ہو گیا تھا۔ کسی بھی ادبی زبان کی نشو ونما اس کے بولنے والوں کے فکری اور تہذیبی معیار پر منحصر ہے۔ پست تہذیب اور گھٹیا فکر کے ساتھ اعلیٰ ادبی زبان کا پروان چڑھنا ممکن نہیں ہے۔ دہلی اور اس کے بعد خاص طور پر لکھنؤ کی زبان کی خوبی وہاں کی تہذیبی ترقی' نفاست اور نزاکت کی رہینِ منت رہی ہے لیکن یہ تہذیب مٹ رہی تھی اور اس میں گراوٹ آ چکی تھی۔ اقبال کی فکر اور ان کے اعلیٰ ترین جذبات نے دہلی اور لکھنؤ ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کو ایک ایسا شعری سرمایہ دیا جس کی زبان ان تمام دبستانوں سے زیادہ بلند اور معیاری ہے۔ اقبال نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے نئی علامتیں تراشیں' نئی ترکیبیں بنائیں اور اظہار کے نئے لہجے وضع کیے جس کے سامنے دہلی اور لکھنو کے شعرا کی زبان ہی نہیں ہاتھ پاوں بھی شل ہو جاتے ہیں۔ یہ کہنا کہ اقبال غیر زبان داں تھے لہٰذا ان کی زبان سے سند نہیں لی جا سکتی ایک ناسمجھی کی بات ہے۔ اقبال نے اردو کی شعری زبان کو جس منزل تک پہنچا دیا ہے ابھی تک اردو شعراء اس کو حیرت سے تک رہے ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ بغیر عظیم فکر کے اقبال کے انداز میں شعر کہنا مضحکہ خیز ہو گا۔ اقبال نے غزل کو جس مقام پر پہنچایا ہے اس میں اور اردو کی روایتی شاعری میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

اگر کج رو ہیں انجم آسمان تیرا ہے یا میرا مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

یہ اور دوسری غزلوں کا کینوس اس کی لفظیات' اس کا لہجہ' بیان کا اختصار' معنی کا وفور' اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی نغمگی' فکر کی بلندی اور کتنے ہی ایسے اوصاف ہیں جو کسی اور شاعر کے یہاں یکجا ملتے ہوں۔ یہی حال منظومات کا ہے کہ اقبال کی گفتگو ڈوپٹے اور پشواز سے نہیں ہے۔ بلکہ وہ زندگی اور تہذیب کے اعلیٰ ترین موضوعات پر گفتگو کرتے ہیں۔ اس گفتگو میں وہ معمولی لفظ کو ایک اہم علامت اور تلازمہ بنا دیتے ہیں۔ ان کی گفتگو میں اگر اینٹ اور پتھر کا بھی ذکر آ جائے تو اس کے معنی کہیں کے کہیں پہنچ جاتے ہیں۔ مُصوری یا فن تعمیر' موسیقی ہو یا شاعری اقبال کے نزدیک ان سب میں اُسی وقت حقیقی حسن و جمال پیدا ہو سکتا ہے جب ان کی تخلیق میں اہل فن کا

اخلاص شامل ہو۔ اس کو انھوں نے چند لفظوں میں کہا ہے۔ اس طرح کہنے کا کسی اور شاعر میں حوصلہ کہاں۔

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

جس شاعر کی زبان پر جب کوئی لفظ آئے اور اس لفظ کے معنی میں ایک نئی وسعت پیدا ہو، زبان و فن کو ایک نیا زاویہ اور جہت ملے اس کے باوجود اگر کوئی اس کو اہلِ زبان نہ مانے تو اس میں زبان کا اور اس کے نہ ماننے والے کا ہی نقصان ہے۔

چشمۂ آفتاب راچہ گناہ

ooo

نہ زباں کوئی غزل کی ، نہ زباں سے باخبر میں
کوئی دلکشا صدا ہو، عجمی ہو یا کہ تازی

o

لطف بڑھ جاتا ہے اقبالؔ سخن گوئی کا
شعر نکلے صدفِ دل سے گہر کی صورت

حوالے اور حواشی

(۱) صوفی — صفحہ ۲۶

(۲) ذکی — " ۳۹

(۳) حسین(۱) — " ۴۷

(۴) ایضاً — " ۲۸

(۵) گیان چند(۱) — " ۳۶ (گیان چند نے رسالۂ زبان و گلدستۂ زبان لکھا ہے پتہ نہیں کیوں)

(۶) ایضاً — " ۳۷

(۷) حسین(۱) — " ۲۹_۳۱

(۸) گیان چند(۱) — " ۳۷_۳۸

(۹) حسین(۱) — " ۲۹ ۰

(۱۰) حسین(۲) — " پوری کتاب

(۱۱) گیان چند(۱) — " ۳۸_۴۰

(۱۲) حسین(۱) — " ۳۱

(۱۳) تاج — " ۸_۲۴ نیز برنی(۱) صفحہ_۶۹

(۱۴) برنی(۲) — " ۹۵۱

(۱۵) برنی(۱) — " ۶۲

(۱۶) ایضاً " ایضاً

(۱۷) حسین(۱) " ۴۲_۴۳

(۱۸) ایضاً " ۴۹

(۱۹) ایضاً " ایضاً

(۲۰) ایضاً " ۷۰

(۲۱) ایضاً " ۷۱_۷۳

(۲۲) ایضاً " ۴۵

(۲۳) ایضاً " ۴۶

(۲۴) ایضاً " ۸۰

(۲۵) ایضاً " ۸۳

(۲۶) برنی(۱) " ۶۹_۷۰

(۲۷) عیش(واسوخت دوّم) " ۱۰۶

(۲۸) ایضاً(واسوخت اوّل) " ۸۰_۸۱

(۲۹) احمد(واسوخت ہفتم) " ۶۰_۶۲

(۳۰) تاج " ۸_۲۴

(۳۱) برنی(۱) " ۵۷۷

(۳۲) ایضاً " ۱۵۵ نیز قریشی صفحہ_۱۴

کتابیات واشارات

(احمد) کریم الدین احمد : امیر مینائی کا غیر مطبوعہ کلام' رسالہ اردو' جنوری ۱۹۵۸ء

برنی (۱) مظفر حسین برنی : کلیات مکاتیب اقبال جلد اوّل' دہلی ۱۹۸۹ء

برنی (۲) مظفر حسین برنی : کلیات مکاتیب اقبال جلد دوّم دہلی ۱۹۹۱ء

(تاج) تصدق حسین تاج : مضامین اقبال' حیدر آباد ۱۳۶۲ھ م ۱۹۴۳ء

حسین (۱) سید سلطان محمود حسین : اقبال کی ابتدائی زندگی' لاہور ۱۹۸۶ء

حسین (۲) سید سلطان محمد حسین : علامہ اقبال کے استاد شمس العلماء مولوی
سید میر حسن: حیات وافکار
اقبال اکاڈمی لاہور ۱۹۸۱ء

(ذکی) سید محمد ذکی : روایاتِ اقبال محولہ ڈاکٹر سید محمود حسین:
اقبال کی ابتدائی زندگی لاہور ۱۹۸۶ء

(صوفی) خالد نظیر صوفی : اقبال درونِ خانہ
لاہور ۱۹۷۱ء محولہ ڈاکٹر سید محمود حسین

(عیش) منشی فدا علی عیش : شعلۂ جوالہ' مطبوعہ نولکشور لکھنو ۱۲۸۴ء م ۱۸۶۷ء

(قریشی) محمد عبداللہ قریشی : معاصرین اقبال کی نظر میں' مجلس ترقی ادب
لاہور ۱۹۷۷ء

گیان چند (۱) گیان چند جین : ابتدائی کلام اقبال' حیدر آباد ۱۹۸۸ء

گیان چند (۲) گیان چند جین : اردو مثنوی شمالی ہند میں جلد اوّل و دوّم
انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۸۷ء

O

''مجھ کو یہ خیال ہمیشہ روحانی تکلیف دیتا ہے کہ آنے والی مسلمان نسل کے قلوب ان واردات سے یکسر خالی ہیں جن پر میرے افکار کی اساس ہے۔ لیکن آپ کے خط سے مجھے ایک گونہ مسرت ہوئی۔ اِن اشعار کی دقّت زبان کی وجہ سے نہیں، میں تو اتنی فارسی ہی نہیں جانتا کہ مشکل زبان لکھ سکوں۔ دقّت جو کچھ بھی ہے، واردات و کیفیات کے فقدان کی وجہ سے ہے۔ بہر حال آپ کی کوشش ایک مبارک فال ہے۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ جذباتِ انسانی کی تخلیق یا بیداری کے کئی ذرائع ہیں، جن میں ایک شعر بھی ہے اور شعر کا تخلیقی یا ایقاظی اثر محض اس کے مطالب و معانی کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس میں شعر کی زبان اور زبان کے الفاظ کے صَوت اور طرزِ ادا کو بھی بہت بڑا دخل ہے''۔

(مکتوبِ اقبال مورخہ ۱۰ر مئی ۱۹۳۰ء۔ بہ نام مولوی صالح محمد، اقبال نامہ، حصہ دوم ص۔ ۳۷۰۔۳۷۱۔ مرتبہ: شیخ عطاء اللہ) مطبوعہ ۱۹۵۱ء

پروفیسر عبدالستار دلوی

اقبال کا نظریۂ زبان

اقبال کا شمار اردو کے نابغۂ روزگار شعراء میں ہوتا ہے۔ وہ ایک ممتاز عالمی شاعر ہیں جن کی شاعری متنوع افکار اور اندازِ نظر کے لیے شہرت رکھتی ہے۔ ان کی شاعری کا کیف ان کی شعریت، محاکات، منظر نگاری، حب الوطنی، حریت و انقلاب اور فلسفیانہ افکار کا حسین امتزاج پیش کرتی ہے۔ ان کے فلسفیانہ افکار میں خودی، عشق، زندگی اور عمل بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ اسی کے لیے حب الوطنی، عالمِ اسلام اور ملّی مسائل پر ان کے افکار اور عالم انسانیت کی عظمت اور انسانی برادری کا احترام ان کی شاعری میں اساسی اہمیت کے حامل ہیں۔

اقبال کے اسلامی تصورات اور عالم اسلام سے ان کے خطاب کی وجہ سے بعض سیاسی حلقوں میں ان کی شاعری اور شخصیت کو تنگ دلی اور تعصّب کی نظروں سے بھی دیکھا گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقبال کی شاعری اور افکار کو پارہ پارہ کر کے دیکھنے کی بجائے اسے ''کل'' میں دیکھنا ہی اقبال کی شاعری سے انصاف کا باعث ہوسکتا ہے۔ پھول کی پنکھڑیوں کو الگ الگ کر کے دیکھنے سے اس کا حسن اور خوبصورتی کو محسوس نہیں کیا جا سکتا۔ شاعر کے افکار کو بھی پھول کے حسن کی طرح ایک ''کل'' میں دیکھنا ضروری ہے۔ انسان کی شخصیت کے مختلف پہلو ہوتے ہیں اور اس کی شخصیت کی تعمیر مختلف حالات و واقعات تاریخی اور جغرافیائی کیفیات اور تجربات کے تابع ہوتی ہے۔ لہٰذا اقبال کی شخصیت اور شاعری کا مطالعہ کرتے وقت مذکورہ حقیقتوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ عالمِ اسلام سے محبت اور ان کے ملّی تصورات اور حب الوطنی میں کوئی تصادم یا Conflict نہ ہوتے ہوئے وہ ان کی شخصیت کا حصہ ہیں۔ اقبال کو جہاں ہندوستانی قوم پرست ہونے کی وجہ سے ملک کی روایات، تاریخ، عظمت اور اس سے جڑا ہوا ان کا شخص عزیز ہے وہیں ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے انہیں اسلام اور عالمِ اسلام کی زبوں حالی بھی پریشان کرتی ہے۔ یہ پریشانی وسیع تر ملکی اور اسلامی معاشرہ کی زبوں حالی ہے جو استعماریت کے ظلم و جور کے

تحت سارے مشرق کے لیے سیاسی و معاشی استحصال کی وجہ سے پریشان کن تھی' لہٰذا اقبال کی حب الوطنی اور ملّت سے ان کی محبت اس مخصوص سیاسی پس منظر میں ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔

اقبال اُردو کے ایک عظیم محبِ وطن شاعر ہیں۔ ان کی حب الوطنی کی مثالیں ان کی شاعری میں بے شمار ہیں۔ ان کا مشہور ''ترانہ ہندی'' ..... سارے جہاں سے اچھا ..... '' جو انھوں نے اگست ۱۹۰۴ء میں تحریر کیا' اس کی اولین مثال ہے۔ یہ ہندوستان کا قومی ترانہ تھا اور آج بھی اسے ہمارے دوسرے قومی ترانے کی حیثیت حاصل ہے۔ بانگِ درا کی بیش تر منظومات میں اقبال ایک محبِ وطن کی حیثیت سے اپنے مادرِ وطن کے گیت گنگناتے ہیں اور اس کی زبوں حالی' ظلم و جور' آپسی منافرت' فرقہ پسندی اور غلامانہ زندگی پر خون کے آنسو روتے ہیں۔ وہ ہندوستان کی عظمتِ رفتہ کے ثنا خواں ہیں اور اس کے غلامی کی زنجیروں سے آزاد ہو کر پرشکوہ مستقبل کے آرزومند ہیں۔ وہ تفرقہ اور آپسی منافرت کے خلاف ہندوستانیوں کو آگاہ کرتے ہیں اور وطن کی حدود میں پیار و محبت کے لیے ان کے ذہنوں کو بدلنے کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔ اس مخصوص سیاق میں ان کی نظمیں 'ہمالہ' 'تصویرِ درد' 'ہندوستانی بچوں کا گیت' 'رام' ''سوامی رام تیرتھ''، 'آفتاب'، 'نانک' وغیرہ ان کے اسی جذبہ حب الوطنی کے بے مثال نمونے ہیں۔ بال جبریل میں ساقی نامہ ان کی چند شاہکار نظموں میں سے ایک ہے۔ اس میں بھی ان کے جذبہ وطن پرستی کے نمونے موجود ہیں اور ضربِ کلیم' جو ان کی اُردو شاعری کا تیسرا مجموعۂ کلام ہے (مطبوعہ ۱۹۳۶ء) میں بھی ان کی حب الوطنی شدت کے ساتھ قائم و دائم ہے اور ان کی اسلامیت یا اسلامی افکار کے زیر دام نہیں آئی۔ اس لیے کہ اسلام کی تعلیمات میں حُبِ وطن کو نصف ایمان کی حیثیت حاصل ہے۔

''ضربِ کلیم'' میں اقبال اپنی نظم ''شعاعِ اُمید'' میں اپنی حب الوطنی کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اک شوخ کرن ' شوخ مثال نگہ حور
آرام سے فارغ صفتِ جوہر سیماب
بولی کہ مجھے رخصت تنویر عطا ہو
جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرّہ جہاں تاب
چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو

جب تک نہ اُٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب
خاور کی اُمیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبالؔ کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشم مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُر ناب
اس خاک سے اُٹھے ہیں وہ غوّاصِ معانی
جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب
بت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب

مشرق سے ہو بیزار' نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

اُنیسویں صدی کے ربع آخر میں ہندوستان سیاسی' معاشرتی اور سماجی حیثیت سے روبہ زوال تھا۔ اگر ایک طرف سامراج کے خلاف ہمارے اسلاف نبرد آزما تھے' تو دوسری طرف خود ہندوستانی بھی مذہب' تہذیب اور زبان کے مسائل میں اُلجھ کر آپس میں برسر پیکار تھے۔ اُردو جو ہندوستان کی سب سے مقبول اور رابطۂ عامہ کی زبان تھی' اب لسانی تعصّب کے بوجھ تلے دبائی جارہی تھی۔ سرسیّد اور ان کے رفقاء اردو زبان کا مقدمہ پیش کررہے تھے' مگر انگریزوں کی طرف سے اردو کے خلاف ہندی کو ہندو مذہب کی علامت کے طور پر ترقی دینے کے منصوبے بنائے جاچکے تھے اور اس طرح اردو کے خلاف جو ایک مشترکہ تہذیب کی نشانی تھی' ایک سیاسی اور لسانی سازش رچی گئی تھی۔ اردو جو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ میراث تھی اسے دو فرقوں کے درمیان تقسیم کیا جارہا تھا۔ سرسیّد اور ان کے رفقا نے اس کی مخالفت کی' مگر حکومت نے اردو کے خلاف رچی ہوئی اس سازش کو طاقت عطا کی۔ اردو ہندی کی اس جنگ میں جس کے پس پشت

انگریز سامراج کا ذہن کام کر رہا تھا' تحریکِ آزادی کے لیے بہت بڑی رکاوٹ تھا۔ یہ وقت سیاسی' سماجی اور لسانی ہر اعتبار سے متحدہ قومیت کا طلب گار تھا' ضرورت اس بات کی تھی کہ ہندوستانی بلا امتیاز مذہب اور زبان متحدہ رہیں تا کہ آزادیٔ وطن کے عظیم تر مقصد کو اتحاد اور اتفاق کے ذریعہ حاصل کیا جا سکے۔ اسی پس منظر میں مہاتما گاندھی نے اردو اور ہندی کے مسئلہ کو ہندوستانی کے تصور کے ذریعہ حل کرنے کی کوشش کی۔ گاندھی جی کا ہندوستانی کا نظریہ ہندوستان کی قومی زبان کا ایک ایسا نظریہ تھا جس میں اردو اور ہندی دونوں برابر کی شریک تھیں۔ اس نظریے کے تحت فارسی رسم الخط اور دیوناگری لکھاوٹ کو قبولیت حاصل تھی۔ گاندھی جی کی صراحت کے مطابق ہندوستانی وہ زبان ہے جسے اُتر ہندوستان میں ہندو اور مسلمان عام بول چال میں استعمال کرتے ہیں جس میں عربی اور سنسکرت کے بوجھل اور نامانوس لفظ کم سے کم استعمال کرتے ہیں۔ ''ہندوستانی'' کے نظریے کی تائید سبھی رہنماؤں نے کی۔ راجندر پرساد' پنڈت نہرو' سروجنی نائیڈو' مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ۔ بیش تر رہنما اس مسئلہ میں مہاتما گاندھی کے ہم خیال تھے' مگر بابو پرشوتم داس ٹنڈن اور ان کے ساتھی تھے جو اردو کی مخالفت اور ہندی کی موافقت میں اپنی ساری طاقت صَرف کر رہے تھے۔ مسلم لیگ نے جب اپنی سیاسی اہمیت منوالی تو اس کے پس پشت ''اردو'' کی بقا اور اس کی اہمیت بھی پیش نظر تھی۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اس عہد کے سب سے بڑے افسانہ نگار اور ناول نویس پریم چند جو اردو کے ادیب تھے' انہوں نے بھی ملکی اتحاد کے پیش نظر گاندھی جی کی پُر زور حمایت کرتے ہوئے قومی زبان ہندوستانی کی تائید کی۔

اقبالؔ' اس عہد کے ہندوستان کے سب سے بڑے شاعر تھے۔ ان کا سیاست سے ایک کمزور سا رشتہ بھی رہا' مگر وہ گاندھی کی گوپیوں میں شامل نہ ہونے کے باوجود' محض اپنی حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار اور نفاقِ کبر و مسلماں کو شدت سے ناپسند کرتے ہوئے' اتحادِ وطن کی خاطر ہی نہیں بلکہ تمام تر لسانی ادراک و شعور کے ساتھ اردو ہندی کے مناقشے کو ناپسند کرتے تھے۔ انہوں نے بانگ درا کے ظریفانہ کلام میں اردو اور ہندی کے اس جھگڑے کے بارے میں ایک شعر میں اشارہ کرتے ہوئے لکھا تھا۔

یا باہم پیار کے جلسے تھے' دستورِ محبت قائم تھا
یا بحث میں اردو ہندی ہے' یا قربانی یا جھٹکا ہے

اقبالؔ کی مایہ ناز تصنیف(Reconstruction of Religius Thoughts in Islam) (تشکیل الٰہیات جدید) اسلامی فکر اور فلسفہ کے حوالے سے بہت مشہور ہے۔ اقبالؔ کی یہ کتاب دراصل اُن کے ان خطبات پر مشتمل ہے جوانہوں نے مدراس میں دیے تھے۔ اقبال کا جنوبی ہند کا یہ سفر اقبال کی زندگی کا ایک غیر معمولی سفر تھا۔ اس سفر کی علمی افادیت غیر معمولی تھی۔ ان کے شاعرانہ افکار' ملّی تصوّرات' اسلامی فکر و فلسفہ جس کی تشریح اور وضاحت شاعرانہ پیرایۂ بیان میں نہیں ہوسکتی تھی' تشکیلِ الٰہیات جدید میں محفوظ ہوگئیں۔ اقبالؔ کے جنوبی ہند کے اسی سفر کے دوران انہیں مختلف انجمنوں نے مدعو کیا۔ اس سلسلہ میں انجمن ترقیٔ اردو' مدراس [1] اور ہندوستانی پرچار سبھا' مدراس نے اقبال کے اعزاز میں ایک جلسہ عام کا اہتمام کر کے ان کی خدمت میں سپاس نامے پیش کیے۔ ان سپاس ناموں کے جواب میں اقبال کی تقریر ان کی قومی زبان' اردو اور فلسفۂ زبان پر ایک نادر و یادگار تقریر ہے۔ اس تقریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال صرف فلسفہ عجم' فلسفۂ خودی اور اسلامی فکر و فلسفہ اور شعر و ادب کے ہی عالم اور مفکر نہ تھے بلکہ فلسفۂ زبان پر بھی غیر معمولی بصیرت رکھتے تھے۔ فلسفۂ زبان کا یہ ادراک' اردو' ہندی اور ہندوستانی کے حوالے سے بہت اہم ہے' جو انیسویں صدی کے ربع آخر سے نہ صرف اقبال کی زندگی تک بلکہ ہندوستان کی آزادی کے بعد سے اب تک ہندوستان کو درپیش ہے۔ اس کی معنویت آج بھی قائم ہے۔ لہٰذا اقبال کے یہ لسانی افکار اردو' ہندی اور ہندوستانی کے سیاق میں آج بھی اپنی اہمیت رکھتے ہیں۔ قومی زبان کے اس لسانی مسئلہ پر وہ گاندھی جی کے نظریہ قومی زبان سے نہ صرف ہم آہنگ ہیں بلکہ بانگِ درا میں ''ظریفانہ''..... کے تحت ان کے مذکورہ شعر کے پیشِ نظر ایسا لگتا ہے کہ قومی زبان اور اردو اور ہندی کے حوالے سے جو بحثیں چل رہی تھیں' ان میں اقبال' گاندھی سے اگر متاثر نہیں تو ان کے نظریہ کے مساوی اپنا نظریہ بھی قائم کر چکے تھے جو گاندھی جی کے تصوّر قومی زبان سے ہم آہنگ تھا۔

اقبالؔ نے اردو' ہندی اور قومی زبان کے تعلق سے جو افکار پیش کیے ہیں ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ گاندھی جی کے برعکس جو اس مسئلہ کو محض سیاسی نوعیت سے دیکھ رہے تھے' اقبال کی نظر ایک ماہرِ زبان (Linguist) کی تھی۔ انہوں نے اس تقریر میں زبانوں کی اہمیت اور لفظ و معنی

کے رشتے کو جس زاویہ نگاہ سے دیکھا ہے وہ سیاسی نظریہ سازی سے بالکل مختلف ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ بلوم فیلڈ' ساسوریا سپیر (Sapir) کے ماہرانہ لسانی و تجزیاتی و سائنسی انداز سے زبان کے مسئلہ پر غور کرتے تھے۔

فلسفۂ زبان اور اردو کے بارے میں اقبال کی یہ تقریر جنوری ۱۹۲۹ء کی یادگار ہے۔ اس اردو تقریر کو مشہور انگریزی اخبار The Hindu مورخہ ۲۴ر جنوری ۱۹۲۹ء نے بھی اختصار کے ساتھ شائع کیا۔ یہ تقریر مدراس کے گوکھلے ہال میں منعقد کی گئی تھی' جس میں مدراس کے اردو اور ہندی کے واقف کار یقیناً کثیر تعداد میں موجود تھے۔ اس میں سرکاری اور غیر سرکاری افسران بھی شریک تھے۔ انجمن ترقیٔ اردو' مدراس کے صدر حاجی جلال عبدالکریم تھے۔ اقبال کو خوش آمدید کہنے کے بعد حاجی جلال عبدالکریم صاحب نے انجمن کے اعزازی سکریٹری جناب عبدالحمید حسن سیٹھ سے سپاس نامہ پڑھنے کی درخواست کی۔ انہوں نے استقبالیہ تقریر میں کہا کہ اقبال کی اردو نظموں اور غزلوں نے فارسی اور اردو شاعری میں انقلاب پیدا کیا ہے اور ان کی شہرت ہندوستان کی سرحدوں سے نکل کر یورپ کی سرحدوں تک پہنچ گئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اقبال کا یہ ایک اہم کارنامہ ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ ہندوستانی مسلمانوں کو مادہ پرست انگریزی سامراج سے محفوظ کرنے کی کوشش کی اور ان میں روحانیت کی روح پھونکی۔ انہوں نے حاجی جمال محمد کا بھی شکریہ ادا کیا جنہوں نے اسلام پر خطباتِ مدراس کی بنیاد رکھی۔ اس موقع پر اقبال کی خدمت میں ہندی میں دیوناگری اور اردو رسم الخط میں بھی' ہندوستانی پرچار سبھا' مدراس کی طرف سے سپاس نامہ پیش کیا گیا' جو مہاتما گاندھی کے تصورِ ہندوستانی کے عین مطابق تھا۔ ''ہندو'' اخبار کی خبر کے مطابق یہ جلسہ گذشتہ اتوار کے روز ہوا' چوں کہ یہ خبر پیر کے اخبار میں شائع ہوئی ہے' اس سے ۱۳ر جنوری ۱۹۲۹' مراد لینا شاید غلط نہ ہوگا۔ ورنہ گذشتہ اتوار سے مراد ۶ر جنوری ۱۹۲۹ء ہونے کا بھی احتمال ہے۔

سپاس ناموں کے جواب میں علاّمہ اقبال کی یہ یادگار تقریر درج ذیل ہے

''جس تلطف آمیز انداز میں آپ نے اپنے ایڈریس میں میری خدمات کا ذکر فرمایا ہے' میں اس کے لیے آپ حضرات کا دل سے ممنون ہوں' اگرچہ مجھے یہ قدرت حاصل ہے کہ میں الفاظ کا طلسم باندھ سکتا ہوں تاہم مجھے یہ احساس بھی ہے کہ باوجود

اس قدرت کے تشکر و امتنان کا جو جذبہ میرے دل میں موجزن ہے اس کو کما حقہ ظاہر نہ کر سکوں گا۔ اس لئے اس کوشش کو فی الحال نظر انداز کرتا ہوں اور اس امر کو ترجیح دیتا ہوں کہ جن باتوں کا آپ نے ایڈریس میں ذکر فرمایا ہے ان کے متعلق کچھ کہوں۔ آپ نے میری ادبی خدمات کا ذکر کیا ہے لیکن ان معمولی خدمات کا اعتراف حقیقت میں آپ کی فیاضی کا نتیجہ ہے۔ میں ان تعریفی الفاظ کا مستحق نہیں جو آپ نے میرے متعلق استعمال کیے ہیں۔ جو کچھ مجھ سے ہو سکا۔ اس کے اصل محرک آپ ہی ہیں۔

ہمہ مضمونِ من از تست چہ در دل چہ بہ لب
گوہر از بحر برآری نہ برآری از تست

حضرات! مجھے یہ دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی کہ آپ اردو (یا ہندوستانی) زبان کی اشاعت و ترقی کے لیے سرگرم سعی ہیں اور آپ کو یہ احساس ہو چکا ہے کہ زبان اردو کو فروغ دئے بغیر جنوبی ہند کی سوشیل، تعلیمی و تمدنی مشکلات حل نہیں ہو سکتیں۔ مگر میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ زبان کا مسئلہ ایک ٹیڑھا مسئلہ ہے، زبان احساس زندگی کی معنوی حقیقت کی مظہر ہے۔ جس طرح زندگی میں پیہم کش مکش ہے، اسی طرح انسانی خیالات و افکار میں ہر گھڑی کش مکش کا سلسلہ جاری ہے۔ زبان ہماری زندگی کی معنویت کی عکسی تصویر ہے۔ الفاظ کو دیکھئے، تراکیب پر غور فرمایئے۔ کئی الفاظ متروک ہو جاتے ہیں۔ ان کی جگہ نئے الفاظ مروّج ہو جاتے ہیں، ہر زندہ زبان میں الفاظ و تراکیب کی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ زندگی کی پوری تصویر الفاظ کی کش مکش میں موجود ہے۔ زندگی کی حقیقت اور اس کی مسلسل کش مکش پر غور کرتے ہوئے رومیؔ نے عجیب و غریب استدلال سے کام لیا ہے، دنیا میں ہر چیز یا آکل ہے یا ماکول۔ یا وہ کسی کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے یا کوئی دوسری چیز اسے اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ یہی کیفیت خیالات و افکار کی دنیا میں پیدا ہے۔ جن کے اظہار کا نام زبان ہے۔ مولانا رومؔ فرماتے ہیں۔

ہر خیالے را خیالے می خورد
فکرِ ایں بر فکرِ آں دیگر برد

ایک خیال کو دوسرا خیال کھا جاتا ہے۔ ایک فکرِ انسانی دوسرے فکرِ انسانی پر حملہ کر کے اس پر غالب آجاتا ہے۔ یہی کیفیت لفظ زبان کی دنیا میں جاری ہے۔ جس طرح افکار میں پیہم پیکار

جاری ہے۔ اسی طرح الفاظ میں بھی جنگ رہتی ہے۔ ایک زندگی دوسری زندگی سے پرورش پاتی ہے۔ ایک خیال دوسرے خیال سے پرورش پاتا ہے۔ ایک لفظ دوسرے لفظ سے پرورش پاتا ہے' جس زبان میں نئے خیالات کو اپنے اندر جذب کرنے کی قدرت ہے۔ وہی زبان دنیا میں زندہ رہ سکتی ہے۔ توسیع زبان اسی بات پر منحصر ہے کہ بولنے والے کے افکار و خیالات کیسے ہیں۔ کن الفاظ و تراکیب میں ظاہر ہوتے ہیں۔ پس وہی زبان زندہ رہے گی۔ جس کو بولنے والی قوم ایسے افراد پیدا کرتی رہے جو نئے خیالات پیدا کرتے رہیں اور ان خیالات کے اظہار کے لیے نئے طریق زبان میں مروج کرتے رہیں' پرانے خیالات کو بھی نئے الفاظ میں ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ ایشیاء کی تمام زبانوں پر وقیع نظر ڈالیں گے تو آپ پر خود واضح ہو جائے گا کہ تمام غیر یوروپین زندہ زبانوں میں فقط عربی ایک ایسی زبان ہے جس کا کوئی مستقبل ہے۔ یہ زبان باوجود اتنی پرانی ہونے کے اسی لئے زندہ ہے کہ اپنے اندر نئے خیالات و افکار کو جذب کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔ اگر ہم کو جدید طرز پر سوچنے اور موجودہ زمانے کے افکار و خیالات کو دل میں جگہ دینے اور بذریعہ زبان ان کو ظاہر کرنے کی ضرورت ہے تو ہمیں خود عربی زبان کے بیشتر الفاظ کو اختیار کرنا پڑے گا۔ عہد حاضر کے افکار کو پوری خوبی کے ساتھ ظاہر کرنے کی خوبی غیر زندہ یورپین زبانوں میں ہی ہے۔ میں اسے ایک دو مثالیں دے کر سمجھاؤں گا۔

دیکھئے ہمارے ملک میں بائیسکل پہلے پہل آیا اور لوگوں نے اسے استعمال کرنا شروع کیا تو ہماری زبان میں ہندوستان کی کسی زبان میں اس کو پکارنے یا نام لینے کے لیے کوئی لفظ نہ تھا۔ اسی لفظ بائیسکل کو ہمیں اختیار کرنا پڑا۔ لیکن جب یہی بائیسکل مصر میں پہنچا تو مصریوں کے پاس جو عربی زبان بولتے ہیں' پہلے ہی اس مشین کا عربی نام وضع کرنے کے لیے ایک مادہ موجود تھا۔ عربی میں ایک لفظ ''درج'' ہے۔ جس کے معنی تیز رفتاری کے ہیں ''درّاج'' اس کے مبالغے کا صیغہ ہے۔ مصریوں نے لفظ درّاج کو بائیسکل کے معنوں میں استعمال کرنا شروع کر دیا' چنانچہ وہ بائیسکل کو دراج ہی کہتے ہیں۔ اسی طرح ایک لفظ اسٹیشن کے لیے ہماری زبان میں کوئی لفظ نہیں اور ہم اسٹیشن ہی بولتے ہیں۔ لیکن مصری یا عرب سٹیشن کو ''محطہ'' کہیں گے۔ اسی طرح مصریوں اور عربوں نے یورپین اصطلاحات اور نئے اسماء کے لیے سینکڑوں عربی لفظ وضع کر لئے ہیں۔ عربی خاص قسم کی زبان ہے اور ان زبانوں میں سے ہے جس کو (Synthetic) زبانیں کہتے ہیں۔ اسی طرح

سنسکرت بھی Synthetic زبان ہے۔ ان زبانوں میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ وہ خود اپنے اندر نئے الفاظ وضع کر لیتی ہیں اور نئی تراکیب پیدا کر لیتی ہیں۔ اردو زبان نئے خیالات وافکار کی خاطر تراکیب و اصطلاحات عربی سے مستعار لیتی ہے۔ اسی لیے کہ خود اُردو Synthetic زبان نہیں ہے۔ مغرب میں غالباً جرمن زبان کے سوا اور کوئی زبان Synthetic نہیں۔ اس لیے یورپ کی زبانوں نے بیش تر الفاظ وتراکیب Latin سے مستعار لئے جو Syntehtic ہے۔ عربی زبان زندہ زبان ہے اور ان زبانوں میں ہے جن میں ہمیشہ زندہ رہنے کی خصوصیتیں موجود ہیں۔ باقی زبانوں میں ایسی زبانوں کے لیے زندہ رہنے کا زیادہ موقع ہے جو Synthetic زبانوں سے الفاظ مستعار لیتی ہیں۔ کسی زبان کو قومی زبان اختیار کرنے سے پہلے یہ سوچنا پڑے گا کہ زبان کا انحصار کن باتوں پر ہے۔ جنوبی ہند کے لیے اس امر پر سوچنا اور بھی ضروری ہے۔ کیوں کہ آپ کے ہاں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اردو زبان ہندوستان میں اب ترقی کی اس منزل پر پہنچ چکی ہے کہ اس میں موجودہ زمانے کے علوم کا بہت سا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔

میں اراکین ہندی پرچار سبھا کا ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے ایڈرس دیا ہے۔ ان کا ایڈرس سُن کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ حقیقت میں انہیں مجھ کو علیحدہ ایڈرس دینے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ خود ان کا ایڈرس اس بات کا ثبوت ہے کہ اُردو اور ہندی میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں ایڈرسوں کی زبان کو دیکھیے۔ میں تو ان زبانوں میں کوئی خاص فرق نہیں دیکھتا اور تاریخی اعتبار سے بھی دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں۔ اردو زبان میں مرورِ زمانہ سے کچھ الفاظ داخل ہو گئے ہیں۔ مسلمانوں نے قدرتاً عربی اور فارسی زبان کو اردو میں داخل کیا۔ اسی طرح ہندو عالموں نے سنسکرت کے الفاظ کو۔ اردو زبان میں نہ عربی کے غیر مانوس الفاظ کو شامل کرنا چاہیے اور نہ سنسکرت کے غیر مانوس الفاظ کو ہندی میں شامل کرنا چاہیے۔ سیدھی سادی زبان لکھنی چاہیے۔ اُردو اور ہندی کا جھگڑا محض تعصب اور تنگ دلی کا نتیجہ ہے۔ ورنہ دونوں زبانوں میں عام طور پر الفاظ وہی ہیں۔ اگر ہم بلاضرورت عربی اور سنسکرت کے الفاظ اُردو ہندی میں ٹھونسیں تو یہ مناسب نہیں۔ ہاں رسم الخط کی بات اور ہے۔ ہندی پر محض رسم الخط کی وجہ سے زور دینا ٹھیک نہیں اور نہ رسم الخط کا معاملہ اتنا تکلیف دہ ہے۔ رسم الخط محض لکھنے کے طریق کا نام ہے۔ ایسی بحثیں غیر ضروری ہیں اور اس لیے بھی کہ نہ مسلمان عربی رسم الخط چھوڑنے تیار ہیں اور نہ ہندو، ہندی رسم الخط کو، کوئی ایک

دوسرے پر رسم الخط کو جبراً عاید نہیں کر سکتا۔ لیکن بات تو یہ ہے کہ کسی طرح بھی لکھیں' آخر الفاظ وہی ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ

سخن کز بہر حق گوئی چہ عبرانی چہ سریانی
مکاں کز بہرحق جوئی چہ جا بلسا چہ جا بلقا

اگر نیت میں اخلاص ہے تو کیا عربی رسم الخط' کیا ہندی رسم الخط' کیا شمالی ہند اور کیا جنوبی ہند' میں اپنے دوستوں سے کہوں گا کہ وہ ہندوستان کی اصلی مشکلات پر غور کریں۔ اگر ہندوستان زندہ قوموں میں شمار ہونا چاہتا ہے تو اسے ایک زندہ وسعت پذیر زبان پیدا کرنا ہوگی۔ الفاظ وتراکیب کے اختیار کرنے میں تنگ دلی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ ہمارے ہاں لاہور میں کچھ عرصہ ہوا جا بہ جا انجمنیں قائم کرنے کا لوگوں کو شوق ہوا۔ ہندوؤں نے بھی متعدد انجمنیں قائم کیں۔ مگر لفظ انجمن ترک کر دیا اور بجائے انجمن 'سبھا کا لفظ استعمال کرنے لگے۔ میں نے ایک ہندو دوست سے سوال کیا کہ آخر لفظ انجمن کے ترک کا باعث کیا ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم تو ہندی لفظ لکھنا چاہتے ہیں۔ ہم سبھا لکھیں گے۔ انجمن نہیں لکھیں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ انجمن فارسی زبان کا لفظ ہے اور فارسی سنسکرت کی چھوٹی بہن ہے۔ پھر اس تنگ دلی کے کیا معنی۔ چوں کہ مسلمان لفظ انجمن بولتے یا لکھتے ہیں' اس لیے ہندو اس کو ترک کر دیں۔ خواہ وہ لفظ اپنی اصلیت کے اعتبار سے سنسکرت ہی سے کیوں نہ تعلق رکھتا ہو۔ پروفیسر میکس ملر نے تو اس کے متعلق لمبی بحث کی ہے اور وہ لفظ انجمن اور انگریزی کے لفظ اسمبلی کا ماخذ بھی ایک ہی بتاتے ہیں۔ جہاں تک فارسی کا تعلق ہے' ہندوؤں کو اس زبان کے خلاف کسی تعصب سے کام نہیں لینا چاہیے۔ فارسی کے الفاظ کو محض اس لیے ترک کرنا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ آئے ہیں محض تنگ دلی کا ثبوت دینا ہے۔ شاہ نامہ میں فارسی کے بعض اشعار آپ کو ایسے ملیں گے جن کے تمام الفاظ ماخذ کے لحاظ سے سنسکرت سے تعلق رکھتے ہیں۔ محض تعصب کی وجہ سے فارسی الفاظ کا ترک کرنا مناسب نہیں۔ باقی رہی زبان عربی تو جب ایک Analytic زبان بغیر کسی Syntehtic زبان کی مدد کے زندہ نہیں رہ سکتی تو اگر مسلمان عربی کے بعض ضروری الفاظ وتراکیب کو استعمال کرتے ہیں تو یہ کوئی وجہ نہیں کہ اس سے روکا جائے۔ بغیر ایک زندہ Syntehtic زبان کی مدد کے ہندوستان کی موجودہ زبان ترقی نہیں کر سکتی اور کوئی وجہ نہیں کہ عربی جیسی زندہ Syntehtic زبان سے الفاظ

وتراکیب سے مدد نہ لی جائے۔ دوسری صورت صرف یہ ہوسکتی ہے کہ ایشیا کی اس زندہ Syntehtic زبان کو چھوڑ کر یورپین زبانوں کی تراکیب واصطلاحات اختیار کرلی جائیں۔ ایک زندہ ایشیائی Syntehtic زبان سے اپنی علمی ضروریات میں مدد لینا نہایت ضروری ہے۔ ہاں غیر مانوس الفاظ کے استعمال کی مخالفت میں جو کچھ کہا جائے وہ حق بجانب ہے۔ غیر مانوس اور دقیق الفاظ کے لکھنے والوں کی غرض محض اپنی قابلیت کا اظہار ہوسکتا ہے' ورنہ اس سے فائدہ کچھ نہیں۔ مجھے مسرت ہے کہ یہاں اُردو والوں اور ہندی والوں میں باہم اتفاق ہے اور سچ تو یہ ہے کہ کوئی اختلاف کی وجہ بھی نہیں۔

اس کے علاوہ انجمن ترقی اردو نے اپنے ایڈریس میں موجودہ زمانہ میں مادیات کے اثرات کی طرف اشارہ کیا ہے' وہ اثرات اس وقت یوروپ کو تباہ کر چکے ہیں اور اب ایشیا میں آرہے ہیں۔ مسلمان قوم یوروپ اور ایشیاء کے مابین ایک حد فاصل کا کام دے رہی ہے اور اسلام دونوں براعظموں میں اپنے سچے اور صحیح اصولوں کی وجہ سے عجیب وغریب اثرات پیدا کرتا رہا ہے۔ جن کی وجہ سے جو بنی نوع دنیا کے ان بڑے خطوں میں گم ہورہے ہیں۔ گمراہیوں سے بچ جاتے ہیں جیسا کہ میں کل شام بھی اپنے ایک دوست سے کہہ رہا تھا کہ مسلمانوں کے سامنے دو فرض ہیں۔ ایک تو اسلام کی حفاظت کرنا اور دوسرے نفسِ مذہب کو مادّیات کے مخالفانہ حملوں سے محفوظ رکھنا' موجودہ وقت اسلام کے لیے بے انتہا نازک ہے۔ اسلام اپنی تاریخ میں ایک دفعہ نہیں کئی دفعہ مادّیت کا مقابلہ کر چکا ہے۔ پہلے یہی صورت یونان کے مادّی حملے کے وقت پیش آئی تھی۔ اس وقت علما نے کمر ہمت باندھی اور اس حملے کا نہایت عمدگی اور کامیابی سے مقابلہ کیا۔ لیکن آج کے حالات اور ہیں جہاں تک میں اندازہ کرسکا ہوں' حضرات علماء کی موجودہ علوم وفنون سے غفلت میں محض ان کا قصور ہے اور نہ یہ الزام میں سارے کا سارا ان کو دیتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ گذشتہ دو ایک صدیوں میں اسلامی دنیا میں حالات ہی ایسے پیدا ہوگئے ہیں جن پر قابو پانے کا قوم کو یارانہ تھا۔ اگر آپ نفسِ مذہب کو بنی نوع کی خاطر محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو آپ ایسے علماء پیدا کریں جو مادیت کا مقابلہ کرسکیں۔ میں ممنون ہوں کہ جو ناچیز خدمت میں نے کی ہے۔ اسے آپ نے قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے جو کچھ میں نے کہا ہے یا جو کچھ ابھی دس سال میں ہم کریں گے وہ بہت ہی تھوڑا ہے۔ آپ اندازہ نہیں کرسکتے کہ یوروپ نے کیا کچھ کیا ہے اور کیا کچھ کررہا ہے۔ اس بات کو وہی لوگ جانتے ہیں جو یوروپ کے حالات سے

اچھی طرح واقف ہیں۔ یہ نہایت خطرناک وقت ہے۔ اس وقت اپنی روایات اور اپنے علوم وفنون اور مذہب وتہذیب کو محفوظ رکھنا اور اپنی ہستی کو قائم رکھنا بڑا کام ہے۔

حاجی جمال محمد صاحب کی شخصیت نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ ایک شخص سادہ لباس میں ہے۔ کروڑوں کی تجارت کرتا ہے اور دقیق فلسفیانہ مسائل پر گفتگو کرسکتا ہے۔

اسلام نے اسی Plain Living and High Thinking کی تعلیم دی تھی۔ شکل دیکھو تو درویشوں کی اور دل دیکھو تو بادشاہوں کا۔ اسی زندگی کی سرورِ کائناتﷺ نے ہدایت کی تھی۔ جس وقت سے مسلمانوں نے یہ زندگی چھوڑی اس دن سے زوال شروع ہوگیا۔ ہم سب کو چاہیے کہ اس معاملہ میں حاجی صاحب کی تقلید کریں۔

میں دونوں انجمنوں کا دوبارہ شکریہ ادا کرتا ہوں۔''

اقبالؔ کی مذکورہ تقریر کے دو حصے ہیں۔ تقریر کا پہلا اور بڑا حصہ زبان اور قومی زبان سے متعلق ہے اور دوسرا حصہ یورپ کی مادّیت کے خلاف روحانیت اور اس کی اہمیت سے تعلق رکھتا ہے۔ پہلے حصہ میں اقبالؔ نے زبان اور قومی زبان کے مسئلے پر وضاحت کے ساتھ اظہارِ خیال کیا ہے۔ انھوں نے ابتدا میں زبان کی ماہیت، لفظ ومعنی کے رشتے، زبان کے بننے اور بگڑنے کی کیفیات سے متعلق ایک ماہر زبان کی حیثیت سے وضاحت کرتے ہوئے اور عربی کی Analytical حیثیت اور اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے، واضح الفاظ میں عربی کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے جو مشرق کی قدیم ترین زبان ہونے کے ساتھ ایشیا کی واحد زندہ زبان ہے، جس سے ہندوستان کی سب سے بڑی رابطہ کی زبان اردو کا تعلق ہے۔ اقبال نے اس رابطے کی زبان کو اردو ہی کہا ہے، جو ایک تاریخی حقیقت ہے۔ اردو اور ہندی کی جداگانہ تفریق فورٹ ولیم کالج میں قائم ہوئی، لیکن جسے ایک تحریک کی صورت میں ۱۸۵۷ء کے بعد بھارتیندو ہرش چندر نے آگے بڑھایا۔ وہی جدید ہندی کے بانی اور جدید ہندی کے پہلے ادیب وشاعر ہیں ورنہ تاریخی ولسانی اعتبار سے اردو کو ہندی پر اولیت حاصل ہے۔ ماہرینِ لسانیات نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ کھڑی بولی کا اردو روپ پہلے بنا اور نکھرا اور جدید ہندی نے اس زمانے کی سیاسی اور فرقہ وارانہ فضا کے تحت پرورش پائی۔ اگرچہ بھارتیندو ہرش چندر کے زمانے سے جدید ہندی ادبی اعتبار سے ترقی پارہی

تھی اور اردو کے خلاف ایک محاذ بن گیا تھا، (۲) لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ عام بول چال کی اور مختلف علاقوں کے درمیان رابطہ کی زبان اردو ہی تھی۔ گریرسن نے بھی اپنے مشہور جائزۂ زبان ہند (جلد نہم) میں اردو کی اصلیت اور قدامت پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ ہندی ادب کے مورخ اور نقاد پنڈت رامچند رشُکل نے بھی اپنی کتاب ''ہندی ساہتیہ کا اتہاس'' میں اردو زبان و ادب کے اسلوب کی قدامت اور اصلیت کو قبول کیا ہے۔ ہندوستان کے سب سے بڑے ماہر لسانیات اور ہند آریائی کے سب سے بڑے عالم پروفیسر سینتی کمار چٹرجی نے بھی اپنی عمر کے آخری حصے میں اردو کے تعلق سے اپنی ابتدائی غلط فہمیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ اصل زبان اردو ہی ہے اور ہندی بعد کی پیداوار ہے۔ (۳)

اردو یا ہندوستانی برصغیر میں ایک رابطہ کی زبان ہے اور علاقائی زبانیں بولنے والوں کے ساتھ جو ان کی سماجی، تعلیمی اور تمدنی ضروریات پورا کرتی ہیں' اردو یا ہندوستانی زبان غیر اردو یا ہندوستانی علاقوں میں' ان کی اپنی سماجی' تعلیمی اور تمدّنی ضروریات پوری کرنے کے لیے ضروری ہے۔ تاہم کثیر لسانی ماحول میں اردو یا ہندوستانی کے اپنے مسائل ہیں، جن میں سب سے بڑا مسئلہ علاقائی یا قرب و جوار کی زبانوں کو متاثر کرنے اور متاثر ہونے کا مسئلہ ہے۔ اردو یا ہندوستانی غیر اردو یا ہندوستانی علاقوں میں صرف سوشل، تعلیمی اور تمدنی ضرورتیں ہی پورا نہیں کرتی بلکہ وہ ان کی تہذیبی و تمدنی شناخت کا بھی ذریعہ ہے، جو ان کے تشخص کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ اقبال نے اسی بات کو انتہائی بلیغ انداز میں کہا ہے کہ ''زبان احساسِ زندگی کی معنوی حقیقت کی مظہر ہے، جس طرح زندگی میں پیہم کشمکش ہے اسی طرح انسانی خیالات و افکار میں ہر گھڑی کشمکش کا سلسلہ جاری ہے۔ زبان ہماری زندگی کی معنویت کی عکسی تصویر ہے''۔ یہ کشمکش اور معنویت، زبان کے ماحول، علاقائی اثرات، تاریخی ارتقا اور زمانہ کے تابع ہے۔ زبان کوئی جامد شے نہیں بلکہ وہ مسلسل مختلف قسم کی کشمکشوں سے گذرتی اور لفظ و معنی میں ردوقبول کرتی رہتی ہے یعنی ''کئی الفاظ متروک ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے الفاظ مروّج ہو جاتے ہیں۔ ہر زبان میں الفاظ و تراکیب کی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ زندگی کی پوری تصویر الفاظ کی کشمکش میں موجود ہے''۔ اقبالؔ نے اس لسانی حقیقت کو مولانا روم کے حوالے سے مزید واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ زبان اور فلسفہ زبان پر اقبالؔ کی عمیق نظر حیرت انگیز ہے اور اس سے ان کی شخصیت کا ایک اور وصف سامنے آتا

ہے۔لفظ و معنی کے رشتہ کو اقبالؔ نے مختلف انداز اور مثالوں سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

اقبالؔ کی مذکورہ تقریر سے مندرجہ ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:

۱۔ ''اگر چہ مجھے یہ قدرت حاصل ہے کہ میں الفاظ کا طلسم باندھ سکتا ہوں، تاہم مجھے یہ احساس بھی ہے کہ باوجود اس قدرت کے تشکر و امتنان کا جو جذبہ میرے دل میں موجزن ہے اس کو کما حقہ ظاہر نہ کر سکوں گا''۔

اس سے اقبال کی شاعرانہ اور خطیبانہ صلاحیتوں کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ ایک اردو کے بلند پایہ شاعر تھے اور زبان و بیان، تشبیہوں اور استعاروں، فصاحت اور رنگین بیانی اور مفرّس و معرّب اردو کے استعمال پر قادر تھے، جو ان کا شاعرانہ پیرایۂ بیان بھی رہا ہے، تاہم انھیں اس بات کا احساس تھا کہ علمی اور ادبی زبان اور گفتگو اور عام تقریر کی زبان جس کے مخاطب عوام و خواص برابر ہوتے ہیں، ان کی گفتگو کی سطح اعلیٰ ادبی و شاعرانہ زبان سے مختلف ہونی چاہیے، تاکہ وہ سامعین تک اپنی بات سیدھی سادی زبان میں پہنچا سکیں۔ انھیں اپنے مخاطبین (Interlocuters) کا خیال تھا، لہٰذا انھوں نے الفاظ کا طلسم نہیں باندھا۔ شاعری میں اور علمی سطح پر الفاظ کا طلسم باندھا جا سکتا ہے۔ عوامی سطح پر زبان کی سطح مختلف ہونی چاہیے۔ جدید سماجیاتی اصطلاح میں U & L یعنی Upper Language اور Lower Language کو اقبالؔ نے اپنی تقریر میں ملحوظ رکھا۔

۲۔ ''آپ اردو (یا ہندوستانی) زبان کی اشاعت و ترقی کے لیے سرگرم سعی ہیں اور آپ کو یہ احساس ہو چکا ہے کہ زبانِ اردو کو فروغ دیے بغیر جنوبی ہند کی سوشل، تعلیمی اور تمدنی مشکلات حل نہیں ہو سکتیں''۔

اقبالؔ کے مذکورہ جملوں سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اردو اور ہندوستانی اقبالؔ کے یہاں مترادفات کے طور پر استعمال ہوئے ہیں اور وہ جنوبی ہندوستان کی سماجی، تعلیمی اور تمدنی مشکلات کا اسے واحد حل سمجھتے ہیں۔ اردو اور ہندوستانی اقبالؔ کے یہاں مترادفات کے طور پر استعمال ہوئے ہیں اور وہ جنوبی ہندوستان کی سماجی، تعلیمی اور تمدنی مشکلات کا اسے واحد حل سمجھتے ہیں۔ اردو، ہندوستان کی واحد زبان تھی جو سماجی، تعلیمی اور تمدنی انتظامی معاملات میں کامیابی کے ساتھ برتی جا رہی تھی۔ عثمانیہ یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اردو تھا اور اس کا مزید فروغ ضروری تھا۔

۳۔ ''زبان احساسِ زندگی کی معنویت کا مظہر ہے''۔ یہ اقبالؔ کا ایک انتہائی بلیغ جملہ

ہے جو زبان کی انفرادی اور سماجی اہمیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ ایک طرح کا لسانی تشخص ہے جو زبانوں سے جڑا ہوا ہے۔ اگر یہ تشخص برقرار نہ رکھا جائے تو احساسِ زندگی مٹ جاتا ہے۔

۴۔ ''جس طرح زندگی میں پیہم کشمکش ہے اسی طرح انسانی خیالات و افکار میں ہر گھڑی کشمکش کا سلسلہ جاری ہے۔ ..... ہر زبان میں الفاظ و تراکیب کی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں''۔

اقبالؔ نے الفاظ کی تبدیلی اور پرانے الفاظ کی جگہ نئے الفاظ کے استعمال اور اسی طرح کی لسانی تبدیلیوں کی طرف جو اشارے کیے ہیں وہ علم لسانیات کے بنیادی تصورات اور حقائق کے عین مطابق ہیں۔ الفاظ کی اپنی زندگی ہوتی ہے ارمرورِ زمانہ کے ساتھ یہ پلتے، بڑھتے اور مَر بھی جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے الفاظ، نئی علامتیں اور اصطلاحیں لے لیتی ہیں۔ نئے تصورات اور نئے علوم کے ساتھ نئے الفاظ وضع کیے جاتے ہیں اور اس طرح زبانیں مسلسل تبدیلیوں سے دو چار ہوتی رہتی ہیں۔ دراصل یہ تبدیلیاں زبانوں کی صحت، تندرستی اور زندگی کی علامت ہوتی ہیں۔ صحت مند زبانیں اخذ و قبول کرتی رہتی ہیں اور یہ اخذ و قبول ہی ان کی زندگی کی ضمانت ہوتے ہیں۔ اقبالؔ کی صحت زبان کے بارے میں بہت اعتراضات ہوتے رہے ہیں' کبھی ان کی پنجابیت کو نشانہ بنایا گیا تو کبھی تذکیر و تانیث پر اعتراضات کیے گئے تو کبھی ان کی اردو پر پنجابی کے اثرات اور مقامی محاورہ کا مذاق اُڑایا گیا۔ اردو جیسی بڑی اور وسیع زبان جو ملک کے کونے کونے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اس میں مقامی الفاظ و محاورات، تذکیر و تانیث میں معمولی فرق وغیرہ اردو زبان کی زندگی کی نشانیاں ہیں۔ بڑی زبان کے معیار میں ایک سے زائد تلفظات اور تذکیر و تانیث کا فرق اور مقامی الفاظ اور محاورات کا استعمال اس زبان کی طاقت کے مماثل ہے۔ اقبالؔ کے بہت سارے معترضین سے آج کوئی واقف نہیں ہے، لوگ اقبالؔ سے واقف ہیں اور ان کی ''اغلاط'' آج اردو زبان کی صحت اور اردو زبان کا معیار بن گئی ہیں۔

۵۔ ''ایک خیال کو دوسرا خیال کھا جاتا ہے۔ ایک فکر انسانی دوسرے فکر انسانی پر حملہ کر کے اسی پر غالب آجاتا ہے۔ یہی کیفیت لفظِ زبان کی اس دنیا میں جاری ہے۔ جس طرح افکار میں پیہم پیکار جاری ہے اسی طرح الفاظ میں بھی جنگ جاری رہتی ہے۔ .....''

اقبالؔ کے مذکورہ خیالات بھی جدید لسانیات کی رو سے بہت اہم اور اس کے عین مطابق

ہیں۔خیالات بدلتے رہتے ہیں۔خیال ہی لفظ و معنی کو جنم دیتے ہیں اور جب خیالات بدلتے ہیں تو ان کی جگہ نئے لفظ و معنی استعمال ہوتے ہیں۔زندگی جامد نہیں ہوتی بلکہ یہ حرکی قوت ہے۔زبان، تاریخ کے مختلف ادوار میں بدلتی رہتی ہے اور نئے الفاظ اور ان کے نئے معنی پیدا ہوتے ہیں۔بہت سارے الفاظ جو سو دو سو سال قبل استعمال ہوتے تھے اور معیاری کہلاتے تھے۔مرورِ زمانہ کے ساتھ ان میں تبدیلیاں ہوگئی ہیں اور اب ہماری جدید لغت کا حصہ نہیں رہے۔نئی تحقیقات کے ساتھ نئی ایجادات سامنے آتی ہیں اور نئی ایجادات کے ساتھ نئے لفظ وضع کیے جاتے ہیں۔یا نئے تصورات اور ایجادات کے ساتھ لفظ بھی درآمد کیے جاتے ہیں۔یہ ایک لسانی اور تہذیبی قانون اور نظام کے تحت ہوتا ہے۔اقبالؔ نے مذکورہ بیان میں اسی لسانی حقیقت پسندی کی طرف اشارہ کیا ہے۔بقول شبلی:''خیال مادہ سے پیدا ہوتا ہے''۔اور ہر مادہ کے ساتھ ایک نیا لفظ وجود میں آتا ہے۔

۶۔ ''جس زبان میں نئے خیالات کو اپنے اندر جذب کر لینے کی قدرت ہے، وہی زبان دنیا میں زندہ رہ سکتی ہے۔توسیع زبان اس پر منحصر ہے کہ بولنے والے کے افکار و خیالات کیسے ہیں، کن الفاظ و تراکیب میں ظاہر ہوتے ہیں۔پس وہی زبان زندہ رہے گی جس کو بولنے والی قوم ایسے افراد پیدا کرتی ہے جو نئے خیالات پیدا کرتے ہیں اور ان نئے خیالات کے اظہار کے لیے نئے طریق زبان میں مروّج کرتے ہیں''۔

مذکورہ خیالات میں اقبالؔ فلسفۂ زبان کے بنیادی نظریات کی توضیح کرتے ہیں۔زبانیں نئے خیالات کو اپنے اندر جذب کر کے اپنے آپ کو وسیع سے وسیع تر بناتی ہیں۔اگر نئے خیالات اور ان کے زیر اثر پیدا ہونے والے الفاظ کو ہم اپنی زبان کا جزنہ بنائیں تو زبان سکڑ اور سمٹ جاتی ہے۔انگریزی زبان کی وسعت نئے نئے خیالات اور الفاظ جذب کرنے میں ہے اور اس وسعتِ نظری کی بنا پر انگریزی بولنے والی قوم بھی ایک جاندار قوم ہے اور قوموں کی عظمت اس کے لسانی سرمایہ کی وسعت پر منحصر ہوتی ہے۔اردو زبان بھی ہندوستان کی غالباً واحد زبان ہے جس میں خیالات اور خیالات کے ساتھ الفاظ و معانی کے انگیز کرنے کی پوری طاقت ہے۔یہ ایک ملواں زبان ہے جس میں عربی، فارسی، انگریزی اور دیگر زبانوں کے الفاظ بہت آسانی کے ساتھ اور سرعت سے جذب ہو جاتے ہیں۔اگر ابتداء اُس نے عربی فارسی الفاظ کو اپنے اندر جذب کر لیا تو

اُنیسویں اور بیسویں صدی میں اس نے انگریزی، پرتگیزی اور فرانسیسی زبانوں کے الفاظ قبول کر کے اپنے آپ کو وسعت دی۔ نئے علوم کے ساتھ نئے سائنسی لفظ اس میں در آئے اور نئے سائنسی الفاظ کے ساتھ ان کے معیناتی افق بھی اردو زبان کی وسعت کا باعث بنے۔

۷۔ ''آپ ایشیا کی تمام زبانوں پر دقیق نظر ڈالیں گے تو آپ پر خود واضح ہو جائے گا کہ تمام غیر یوروپین زندہ زبانوں میں فقط عربی ایک ایسی زبان ہے جس کا کوئی مستقبل ہے''۔

یورپین زبانوں پر لاطینی اور یونانی زبانوں کے اثرات ہیں جن کی وجہ سے نئے الفاظ وضع کرنے کی ان میں بڑی صلاحیت ہے اور تمام علمی اور سائنسی خیالات کے لیے وہ بہ آسانی نئے لفظ وضع کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ غیر یوروپی زبانوں میں عربی زبان جو سامی خاندان کی زبان ہے لسانی اعتبار سے بہت لچکدار زبان ہے جس میں نئے الفاظ وضع کرنے کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ اقبالؔ نے عربی کی اسی خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں ''بائسیکل'' کے لیے عربی میں ''دراج'' اور ''سٹیشن'' کے لیے ''محطہ'' کی طرف بھی اقبالؔ نے اشارہ کیا ہے۔ انگریزی کے ایسے کئی الفاظ ہیں جن کے لیے سوائے عربی کے، دیگر زبانوں میں لفظ نہیں ملتے اور اس لیے انگریزی الفاظ ہی کو کسی قدر صوتی تبدیلی کے ساتھ یا من وعن استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ انگریزی الفاظ جو ہندوستان زبانوں میں استعمال ہوتے ہیں جیسے سائیکل، سٹیشن، پروفیسر، پرنسپل، ریڈیو، ٹیلی ویژن وغیرہ دخیل الفاظ یا Loan Words کی ذیل میں آتے ہیں۔ عربی میں بھی اس طرح کے دخیل الفاظ ہیں جیسے ''تلیوزیون'' وغیرہ، مگر دیگر زبانوں کے مقابلے میں عربی زیادہ طاقتور اور زندہ زبان ہے جو خیالات کے لیے نئے لفظ اپنی ضرورت کے مطابق وضع کرتی ہے۔ عربی کے علاوہ غیر یورپی زبانوں میں سنسکرت بھی ایک غیر معمولی مالدار زبان ہے جس میں نئے الفاظ وضع کرنے کی غیر معمولی صلاحیت ہے لیکن عربی کے مقابلے میں یہ ایک مردہ زبان ہے جسے صرف دو چار ہزار ہی بول لیتے ہیں۔ وہ بھی ثانوی زبان کی حیثیت سے۔ ہندی، مراٹھی، گجراتی، اور دراویڈی زبانوں میں سنسکرت سے استفادہ کیا جاتا ہے۔

۸۔ اردو پر عام طور سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں عربی اور فارسی کے الفاظ اور اصطلاحیں زیادہ مستعمل ہیں۔ اقبالؔ نے اس اعتراض کا مدلل جواب دیا ہے کہ اس کی وجہ اردو کا غیر Synthetic زبان ہونا ہے اور چونکہ عربی Synthetic زبان ہے، اس کی

اصطلاحیں اور الفاظ نئے خیالات اور علمی اصطلاحیں آسانی سے وضع کرسکتی ہے، عربی الفاظ اور اصطلاحات کے اردو میں استعمال کا یہی جواز ہے۔

۹۔ اقبالؔ نے جنوبی ہندوستان کے حوالے سے بطورِ خاص دراویڈی زبانوں کے ماحول میں اردو کی اہمیت پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''جنوبی ہند کے لیے اس امر پر سوچنا اور بھی ضروری ہے کیوں کہ آپ کے یہاں کئی مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اردو زبان ہندوستان میں اب ترقی کی اس منزل پر پہنچ چکی ہے کہ اس میں موجودہ زمانے کے علوم کا بہت سا ذخیرہ جمع ہوگیا ہے''۔

اقبالؔ کا واضح اشارہ عثمانیہ یونیورسٹی اور دارالترجمہ کی کتابوں کی طرف ہے کہ جن کی وجہ سے اردو کل ہند سطح پر ایک آزمودہ علمی زبان میں کئی سماجی علوم اور خالص سائنسی علوم (Pure Sciences) میں جیسے ریاضی، طبعیات، کیمیسٹری، طب (Medicine) وغیرہ علوم کی کتابیں یہاں ترجمہ کی گئیں اور اصطلاحیں وضع کی گئیں اور یہ زبان عالمی زبانوں سے آنکھ ملانے کے قابل ہوئی۔ اردو کو یہ امتیاز آج بھی نہ صرف جنوبی ہند بلکہ سارے ہندوستان میں حاصل ہے۔ ہماری علاقائی زبانیں ابھی بہت پیچھے ہیں۔

○○○○○

حواشی

(۱) ہندو (Hindu) میں شائع شدہ اس خبر میں ''مدراس اردو سوسائٹی'' لکھا ہے۔ یہ دراصل انجمن ترقی اردو، مدراس ہے۔ The Hindu, Monday,January 14,1929.Page 15

(۲) اردو کے خلاف اس سیاسی اور فرقہ وارانہ محاذ میں یوپی کے گورنر سر میکڈونگل کی خدمت میں جانے والے وفد کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ یہیں سے اردو کے خلاف ہندی کو سیاسی سہارا ملا، جس کے پس پشت انگریزی حکومت کی تفرقہ اندازی کو بڑا دخل حاصل تھا۔ یہ خلیج بعد میں وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی اور اس طرح ادبی اعتبار سے جدید ہندی پیدا ہوئی۔

(۳) India: A Polyglot Nation and its Linguistic Problems Visa Vis National Integration, Bombay,1974.

علامہ اقبال

اُردو زبان پنجاب میں

عنوان مندرجۂ بالا سے گو یہ مفہوم ہوسکتا ہے کہ اس مضمون میں پنجاب اور ہندوستان کی اُردو کے متعلق ایسی بحث ہو جسے ہم ناگوار کہہ چکے ہیں اور جس سے ہم گریز کرنا پسند کرتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ نہیں۔ اس میں بعض محاوراتِ زبان کے متعلق اساتذہ کے کلام سے استناد کر کے جتایا گیا ہے کہ ان کا کس کس طرح استعمال جائز ہے۔ اور ان کے استعمال پر جو اعتراضات ہوئے تھے ان اعتراضات سے بریّت کی کوشش کی گئی ہے۔ جس تحقیق سے شیخ محمد اقبال صاحب نے اس مضمون میں کام لیا ہے وہ قابلِ داد ہے اور اسے بحث کا خاتم سمجھنا چاہئے۔ (مخزن۔ اکتوبر ۱۹۰۲ء)

آج کل بعض اخباروں اور رسالوں میں اہلِ پنجاب کی اُردو پر بڑی لے دے ہو رہی ہے۔ اور یہ ایک عجیب بات ہے کہ اس بحث کے فریق زیادہ تر ہمارے نئے تعلیم یافتہ نوجوان ہیں۔ اُدھر ایک صاحب ''تنقید ہم درد'' جو اخلاقی جرأت کی کمی یا کسی نامعلوم مصلحت کے خیال سے اپنے نام کو اس نام کی نقاب میں پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں۔ ناظر و اقبالؔ کے اشعار پر اعتراض کرتے ہوئے پنجابیوں کی ہنسی اڑاتے ہیں۔ اِدھر ہمارے مُعزز و محترم دوست میر ممتاز علی ایڈیٹر تالیف و اشاعت اور انبالوی صاحب اپنے محققانہ مضامین سے اپنی وسعت خیال کا ثبوت دیتے ہیں۔ ہمارے دوست ''تنقید ہم درد'' اس پر مصر ہیں کہ پنجاب میں غلط اردو کے مروّج ہونے سے یہی بہتر ہے کہ اس صوبے میں اس زبان کا رواج ہی نہ ہو۔ لیکن یہ نہیں بتاتے کہ غلط اور صحیح کے معیار کیا ہے۔ جو زبان بہمہ وجوہ کامل ہو اور ہر قسم کے ادائے مطالب پر قادر ہو۔ اس کے محاورات و الفاظ کی نسبت تو اس قسم کی معیار خود بخود قائم ہو جاتا ہے۔ لیکن جو زبان ابھی زبان بن رہی ہو اور جس کے محاورات اور الفاظ جدید ضروریات کو پورا کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً اختراع کئے جا رہے ہوں اس کے محاورات وغیرہ کی صحت و عدم صحت کا معیار قائم کرنا میری رائے میں

محالات سے ہے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ اُردو زبان جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں تک محدود تھی مگر چوں کہ بعض خصوصیات کی وجہ سے اس میں بڑھنے کا مادہ تھا' اس واسطے اس بولی نے ہندوستان کے دیگر حصوں کو بھی تسخیر کرنا شروع کیا اور کیا تعجب ہے کہ کبھی تمام ملک ہندوستان اس کے زیرنگین ہو جائے۔ ایسی صورت میں ممکن نہیں کہ جہاں جہاں اس کا رواج ہو وہاں کے لوگوں کا طریق معاشرت ان کے تمدنی حالات اور ان کا طرز بیان اس پر اثر کئے بغیر رہے۔ علم السنہ کا یہ ایک مسلم اصول ہے جس کی صداقت اور صحت تمام زبانوں کی تاریخ سے واضح ہوتی ہے۔ اور یہ بات کسی لکھنوی یا دہلوی کے امکان میں نہیں ہے کہ اس اُصول کے عمل کو روک سکے۔ تعجب ہے کہ میز' کمرہ' کچہری' نیلام وغیرہ اور فارسی اور انگریزی کے محاورات کے لفظی ترجمے کو بلا تکلف استعمال کرو لیکن اگر کوئی شخص اپنی اُردو تحریر میں کسی پنجابی محاورے کا لفظی ترجمہ یا کوئی پُر معنے پنجابی لفظ استعمال کر دے تو اس کو کفر و شرک کا مرتکب سمجھو! اور باتوں میں اختلاف ہو تو ہو مگر یہ مذہب منصور ہے کہ اُردو کی چھوٹی بہن یعنے پنجابی کا کوئی لفظ اُردو میں گھسنے نہ پائے! یہ قید ایک ایسی قید ہے جو علم زبان کے اصولوں کے صریح مخالف ہے اور جس کا قائم و محفوظ رکھنا کسی فرد بشر کے امکان میں نہیں ہے۔ اگر یہ کہو کہ پنجابی کوئی علمی زبان نہیں ہے جس سے اُردو الفاظ و محاورات اخذ کرے تو آپ کا عذر بے جا ہوگا۔ اُردو ابھی کہاں کی علمی زبان بن چکی ہے۔ جس سے انگریزی نے کئی ایک الفاظ بدمعاش، بازارلوٹ، چالان وغیرہ کے لیے ہیں اور ابھی روز بروز لے رہی ہے۔

یہ ایک دلچسپ اور نتیجہ خیز بحث ہے جس پر ایک مستقل مضمون لکھا جا سکتا ہے مگر اس مضمون کا مقصد اُن اعتراضات کا جواب دینا ہے جو ''تنقید ہم درد'' صاحب نے میرے اور ناظر کے اشعار پر کئے ہیں۔ میں نے یہ جواب اس وجہ سے نہیں لکھا کہ صاحبِ تنقید نے میرے یا میرے دوست حضرت ناظؔر کے کلام کو اپنی نکتہ چینی کا آماجگاہ بنایا ہے بلکہ میری غرض صرف یہی ہے کہ ایک منصف مزاج پنجابی کی حیثیت سے ان غلطیوں کا ازالہ کروں جو عدم تحقیق کی وجہ سے اہل پنجاب کی اُردو کی طرف منسوب کی گئی ہیں۔ اگرچہ ''تنقید ہم درد'' صاحب نے بالخصوص حضرت ناظر کی نسبت اور بعض بعض جگہ میری نسبت دل آزار الفاظ استعمال کئے ہیں مگر میں باوجود حق اور قدرت کے اس بات سے احتراز کروں گا کیوں کہ فنِ تنقید کا پہلا اُصول یہی ہے کہ اس کا ہر لفظ نفسانیت کے جوش سے مبرا ہو۔ تنقید کی بنا دوستی، محبت اور نیک نیتی پر ہونی چاہئے۔ نہ یہ کہ مضمون تو اپنے

خیال میں از راہِ دوستی لکھیں اور طرزِ بیان ایسا اختیار کریں کہ دوستی دشمنی میں تمیز نہ ہو سکے۔ میر رضی دانش کیا خوب فرماتے ہیں۔

مئے مخور چنداں کہ نشا سدزگل گلچین ترا
پاسبانِ حسنِ پاک خویشتن بودن خوش است

حضرت ناظر کے کلام پر جو اعتراض ''تنقید ہم درد'' صاحب نے کئے ہیں اُن کا جواب انبالوی صاحب نے شافی طور پر دے دیا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ جواب دینے کا حق ادا کیا ہے۔ البتہ لفظ ''سودا'' کے غیر متغیر ہونے کی نسبت جوانہوں نے ارقام فرمایا ہے وہ شافی نہیں ہے۔ اصولِ نحو کے رو سے عربی الفاظ جن کے آخر میں الف ہو غیر متغیر ہیں مثلاً صحرا' میناوغیرہ' مگر ''سودا'' میں اختلاف ہے۔ فصحائے دہلی میں سے مومن مرحوم اور فصحائے لکھنو میں سے آتش مرحوم کے کلام میں یہ لفظ متغیر اور ناسخ مغفور کے کلام میں غیر متغیر ہے۔ اگر حضرت ناظر نے اس لفظ کو غیر متغیر لکھ دیا تو کیا برا کیا اور میری رائے میں سودا بمعنے جنون کو غیر متغیر لکھنا چاہئے تا کہ سودا بمعنے معاملہ بیوپار سے اس کی تمیز ہو سکے۔ میرے اشعار پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں ان میں سے الفاظ ''چلمن کی جھلک'' پر بھی ایک اعتراض ہے ''تنقید ہم درد'' صاحب میرے مقصود فی الذہن کو سمجھتے بھی ہیں اور پھر فرماتے ہیں کہ الفاظ سے یہ مطلب نہیں نکلتا۔ بھلا اگر الفاظ میرے مقصود کے اظہار سے قاصر ہیں تو آپ نے میرا مطلوب کیوں کر سمجھ لیا؟ بہر حال انبالوی صاحب نے مرزا داغ دام فیضہ کا ایک شعر سند میں دے دیا ہے۔ جس میں بعینہ یہی الفاظ انہیں معنوں میں استعمال کئے گئے ہیں جو میرے ذہن میں تھے۔ علی ہذا القیاس انبالوی صاحب نے ''مالا'' کی تانیث بھی مفید الشعرا مصنفہ حضرت جلال لکھنوی کے حوالے سے ثابت کر دی ہے۔ اب بھی اگر مزید ثبوت کی ضرورت ہو تو مولوی سید احمد صاحب سلمہٗ کی فرہنگ آصفیہ ملاحظہ فرمالیجئے۔ باقی اعتراضات کا جواب بالترتیب عرض کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ''تنقید ہم درد'' صاحب انصاف کر کے اپنی غلطی کو تسلیم کریں گے۔

اعتراض اول:

آرزو یاس کو یہ کہتی ہے
اِک مٹے شہر کا نشان ہوں میں

''تنقید ہم درد'' صاحب فرماتے ہیں کہ'' آرزو یاس سے یہ کہتی ہے'' ہونا چاہئے۔ کاش ان کو اساتذۂ اُردو کے کلام پر عبور ہوتا یا کم از کم اس قسم کا نازک اعتراض کرنے سے پہلے اپنا اطمینان کر لیتے۔ اکابر شعرائے قدیم و حال کا کلام اس دعویٰ کا موئید ہے کہ'' کہنا'' کا صلہ'' سے'' بھی آتا ہے اور'' کو'' بھی۔ البتہ ایک باریک فرق ان کے استعمال میں ضرور ہے اور وہ یہ ہے کہ جہاں'' کہنے'' کا مقولہ ایک کلمہ مفرد یا مرکبِ ناقص (ترکیب اضافی یا توصیفی وغیرہ) ہو اور اس میں مفعول اوّل کی کوئی صفت پائی جائے تو ہمیشہ'' کو'' آئے گا۔ مثلاً زید نے عمر کو جاہل کہا یا و بجز'' جامِ جہاں میں کہئے پیمانے کو کیا کہئے'' مگر جہاں مقولہ مرکب ناقص یا کلمہ مفرد بھی ہو لیکن وہ مفعول اوّل کی صفت پر دال نہ ہو اور نیز جہاں مقولہ ایک جملہ یعنے مرکب تام ہو تو'' کہنا'' کا صلہ'' سے'' اور'' کو'' دونوں آتے ہیں۔ مندرجۂ بالا شعر میں'' کہنا'' کا مقولہ مرکب تام یعنے'' اک مٹے شہر کا نشان ہوں'' ہے۔ آپ کا ادعا ہے کہ یہاں'' کو'' کی جگہ'' سے'' ہونا چاہئے۔ میں کہتا ہوں کہ'' سے'' اور'' کو'' دونوں ہو سکتے ہیں اور اساتذہ کا کلام میرا موئید ہے۔ فخر المتقدمین والمتاخرین حضرت امیر علیہ الغفران ایک مشہور غزل میں فرماتے ہیں:

صورتِ غنچہ کہاں تابِ تکلم مجھ کو — منھ کے سو ٹکڑے ہوں آئے جو تبسم مجھ کو
مر کے راحت تو ملی' پر ہے یہ کھٹکا باقی — آ کے عیسیٰ سرِ بالیں نہ کہیں ''قُم'' مجھ کو

دوسرے شعر میں'' کہنا'' کا مقولہ ایک مرکب تام یعنے قُم ہے اور حضرتِ مرحوم اس کا صلہ'' کو'' استعمال کرتے ہیں۔ مومنؔ مرحوم فرماتے ہیں:

یہ قدرت ضعف میں بھی ہے فغاں مجھ کو — کہ دے ٹپکے زمیں پر آسماں کو
دیا اس بدگمان کو طعنۂ غیر — غضب ہے کیا کہوں اپنی زبان کو

شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ جن کے انداز کے جناب حسرت وارفتہ ہیں فرماتے ہیں:

کہیو اے بادِ صبا بچھڑے ہوئے یاروں کو
راہ ملتی نہیں ہے دشت کے آواروں کو

اور لیجئے مرزا رفیع سوداؔ دولت مند بخیل کی ہجو میں فرماتے ہیں:

غرض اُٹھ کر چلا وہ جب واں سے — کہہ گیا کان میں یہ مہمان سے
چاہو جو کچھ کہ اب تناول کو — کہہ دو بلوا کے تم بکاول کو

مرزؔا نے پہلے شعر میں کہنا کا صلہ ''سے'' استعمال کیا ہے اور دوسرے میں ''کو''۔ فرمائیے آپ کے دلیرانہ دعوئے کی تردید ہوئی یا نہیں

اعتراضِ دوّم:

حال اپنا اگر تجھے نہ کہیں اور رکھیں اسے کہاں کے لئے

مذکورۂ بالا بحث میں میں نے ثابت کر دیا ہے کہ ''کہنا'' کا صلہ ''سے'' بھی آتا ہے اور ''کو'' بھی۔ مگر اس شعر پر جو اعتراض کیا گیا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ ''کہنا'' ''تجھے'' کے ساتھ بغیر صلے کے کبھی مستعمل نہیں ہوتا لہٰذا مجھ کو یہ ثابت کرنا ہے کہ جہاں ''کہنا'' کا مقولہ کلمہ مفرد یا مرکب ناقص ہو خواہ اس سے مفعول ثانی کی صفت مترشح ہوتی ہو خواہ نہ ہوتی ہو اور نیز جہاں ''کہنا'' کا مقولہ مرکب تام ہو ''کہنا'' تجھے کے ساتھ بغیر صلے کے بھی مستعمل ہوتا ہے۔ بلکہ ''مجھے'' اور ''تمہیں'' بھی اس قاعدے سے آزاد نہیں ہیں۔ (اسناد)

کیا مدح ہے یہ جو تجھے ہم شاہ کہیں ہیں سچے ہیں وہی لوگ جو اللہ کہیں ہیں
(میر تقی علیہ الرحمۃ)

ایک مولا کہے ہیں ایک خدا کہتے ہیں یا علیؑ جو تجھے کہتے ہیں بجا کہتے ہیں
(میر تقی علیہ الرحمۃ)

نالے کیا نہ کر سنا نوحے پہ میرے عندلیب! بات میں بات عیب ہے میں نے تجھے کہا نہیں
(میر تقی علیہ الرحمۃ)

ہم نشیں تجھ سے میں خاک کہوں خلوت میں آج جو اُس نے کہا ہے سر بازار مجھے
(مرزا داغ دام فیضہ)

ع وہ تیرا مسکرانا کچھ مجھے ہونٹوں میں کہہ کہہ کر
(مومن مرحوم)

ناصح یہ مجھے راست کہے تھا کہ بجز داغ کیا لیوے گا دل دے کے تو ان لالہ رخاں کو
(مرزا رفیع سودا مرحوم)

ع کیا کہئے تمہیں حضرتِ دل بے ادبی ہے
(ظفر مرحوم)

حضرت امیر مرحوم رُوحی فداہ کا بھی ایک شعر یاد آ گیا:

قاصد! یہ زباں اس کی بیاں اس کا نہیں ہے
دھوکا ہے! تجھے اس نے کہا اور ہی کچھ ہے

مگر اس شعر کی دو توضیحیں ہوسکتی ہیں اور ایک اعتبار سے یہ میرے دعویٰ کا موید ہوسکتا ہے، دوسرے اعتبار سے نہیں ہوسکتا۔ ''تنقید ہم درد'' صاحب انصاف کریں۔ بے قصور اقبال اُردو کو اُلٹی چھری سے ذبح کرنے کا مجرم نہیں ہے۔ ہاں! اُس نے اساتذۂ اُردو کی پیروی کی ہے اگر یہ تقلید جرم ہے تو انا اول المجرمین۔

اعتراض سوم:

جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں الخ

''ہوا آنا'' محاورۂ اُردو نہ ہوگا۔ میرا مقصود بھی تو محاورہ نہیں ہے۔ خانِ آرزو مرحوم نے بھی اسی قسم کا ایک اعتراض شیخ علی حزیں علیہ الرحمۃ کے ایک شعر پر کیا تھا مگر مولانا صہبائی مرحوم اس اعتراض کے جواب میں فرماتے ہیں کہ ''ایرادِ الفاظ گاہے بطریق محاورہ و روزمرہ بود کہ مردم رابا ہم درادائے مدعا بے تکلف اتفاق افتد و گاہے برائے تناسب و رعائت محسنات بدیعی الخ۔'' میرے شعر میں پھولوں کو جو مناسبت ہوا اور باغ سے ہے وہ ظاہر ہے اور اسی مناسبت کی وجہ سے یہ لفظ استعمال کیا گیا۔ ہاں! اگر آپ کے اعتراض کا مفہوم یہ ہوا کہ ''آنا'' ہوا کے ساتھ اُردو میں مسموع نہیں ہے تو ظفر دہلوی کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے:

خدا جانے سحر کس کی گلی سے یہ ہوا آئی
حباب آسا جو میرا ہوگیا ہے پیرہن ٹھنڈا

اعتراضِ چہارم

آشیاں ایسے گلستاں میں بناؤں کس طرح اپنے ہم جنسوں کی بربادی کو دیکھوں کس طرح

''تنقید ہم درد'' صاحب فرماتے ہیں کہ ''بناؤں'' اور ''دیکھوں'' کا قافیہ غلط ہے۔ نکتہ چینی کرنے میں تو آپ نے کوئی تامل نہ کیا مگر یہ نہ بتایا کہ غلطی کیا ہے۔ ذرا یہ بھی تو معلوم ہو کہ آپ کو اصول فنِ قافیہ سے کہاں تک واقفیت ہے۔ خیر! مجھے اس بحث سے کام نہیں۔ میں آپ کی

خدمت میں مختصر طور پر یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس قافیہ میں ایطائے خفی ہے جس کو شائگان کے نام سے بھی موسوم کرتے ہین ۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ قواعد قافیہ کے رو سے یہ قافیہ غلط ہے۔ مگر جیسا کہ میں ابھی ثابت کروں گا۔ متقدین اور متاخرین میں سے کسی استاد نے فن قافیہ کے اصولوں کی پابندی نہیں کی اور شائگاں اساتذہ فارس و ہند کے کلام میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ مثلاً عبدالوہاب نشاط شیرازی جو اساتذۂ حال میں سے ہیں ۔ ایک قصیدے میں فرماتے ہیں:

یا کہ گوئی از بلائے زاہداں جاں بُردہ ام　　نیم جانِ بردرِ پیرِ مغاں آوردہ ام
بندگاں را قابلِ خدمت نبودم خویش را　　باہزار امید درسلک سگاں آوردہ ام

ان اشعار میں ''مغاں'' اور ''سگاں'' قافیہ ے۔ ہردوالفاظ میں ''اں'' کی جمع کی علامت ہے لہٰذا یہ دونوں حروف وصل وخروج ہیں اصل قافیہ مغ اور سگ کا ہے اگر جمع کی علامت ساتھ نہ ہوتی تو اکفا ہو جاتا جو عیوب قافیہ میں سے ہے۔

علیٰ ہذا القیاس مومنؔ مرحوم کے اس شعر میں ''پھر دل میں مرے لگی ہے آتش : نالے سے برس رہی ہے آتش'' اور شیخ ناسخؔ مغفور کے اس شعر میں ''جب وادیٔ وحشت میں گذر میرا ہوا ہے: ہر ایک بگولا پئے تعظیم اٹھا ہے'' بھی قافیہ شائیگان ہے۔ حضرت امیر مینائی مرحوم کا مطلع ہے۔

سنگ دل تجھ کو مرے ساتھ یہ کاوش کب تک　　میری سوزش کے لیے غیر سے سازش کب تک

''ش'' یہاں وصل ہے اصل قافیہ کاو اور ساز کا ہے جو اختلاف ردی کی وجہ سے غلط ہے۔ مگر وصل نے اس عیب کو پوشیدہ کرلیا ہے چونکہ حضرت مرحوم نے ردف کی رعائت رکھی ہے جو ضروری تھی اس واسطے بادی النظر میں قافیہ غلط نہیں معلوم ہوتا۔ ساز کا صحیح قافیہ نواز تھا۔ جیسے میر انیس علیہ الرحمۃ کے اس شعر میں ہے

راہ میں کچھ جو سلوک اور نوازش کی ہے
تو نے فرزند یداللہ سے سازش کی ہے

سید فضل الحسن حسرتؔ موہانی ایڈیٹر اُردوئے معلیٰ ایک غزل میں فرماتے ہیں:

دن کو ہم اُن سے بگڑتے ہیں وہ شب کو ہم سے　　رسم پابندیٔ اوقات چلی جاتی ہے
ہم سے ظاہر میں وہ ہر چند خفا ہیں لیکن　　کوشش پرسشِ حالات چلی جاتی ہے

ان اشعار میں ''اوقات'' اور ''حالات'' کا قافیہ بھی شایگان ہے۔ ''ات'' دونوں جگہ علامتِ جمع ہے لہٰذا یہ دونوں حروف زوائد ہیں اصل قافیہ ''اوق'' اور ''حال'' جس میں اختلاف ردی کا ہے یا یوں کہو کہ مصنف نے ردی کا لحاظ ہی نہیں کیا ''بناؤں'' اور ''دیکھوں'' کا قافیہ بھی اسی قبیل سے ہے۔ یہاں ''ون'' بوجہ علامت صیغۂ واحد متکلم ہونے کے زوائد ہیں اصل قافیہ بنا اور دیکھ کا ہے جس میں اختلاف ردی ہے یا یوں کہو کہ ردی کا لحاظ ہی نہیں رکھا گیا۔

اب ''تنقید ہم درد'' صاحب خود ہی انصاف کریں کہ جب اساتذۂ فارس و ہند و دیگر شعرا شائگان کو بلا تکلف استعمال کرتے ہیں تو میں اُس کے استعمال سے عرصۂ تیرِ ملامت کیوں ہوا؟ بلکہ میرا تو یہ دعویٰ ہے کہ اساتذۂ قدیم و حال نے فنِ قافیہ کے تمام بڑے بڑے اُصولوں کی پروا نہیں کی۔ مثال کے طور پر چند اشعار عرض کرتا ہوں۔

(۱) مولانا شمس الدین فقیر صاحب حدائق البلاغت میں فرماتے ہیں کہ حروف تاسیس و دخیل کے سوا اور کل حروف قافیہ قبل ردی ہوں یا بعد ردی سب کی رعائت و تکرار واجب ہے اور اختلاف ناجائز۔ مگر فردوسی اس اُصول کی پروا نہیں کرتے اور فرماتے ہیں:

چہ گفت آں خداوند تنزیلِ وحی
خداوندِ امر و خداوندِ نہی

اس شعر میں ہائے حُطّی اور ہائے ہوّز دونوں قید ہیں۔ ان کی رعائت مندرجۂ بالا اُصول کے رو سے ضروری تھی۔ البتہ بعض عروضیوں نے لکھا ہے کہ جہاں حروفِ قید قریب المخرج ہوں وہاں اس اُصول کی پابندی کی ضرورت نہیں۔ علی ہذا القیاس شیخ سعدی کے اس شعر میں

''چناں نادر افتادہ در دوضۂ کہ در لاجوردی طبق بیضۂ ''و (ردف) کی رعایت ضروری تھی مگر بلبل شیراز نے اپنی نغمہ سرائی کے جوش میں کچھ پروا نہیں کی۔

(۲) مولانا عطاء اللہ شاگرد مولانا جامی علیہ الرحمۃ اور صاحب حدائق المعجم (شمس قیس خوارزمی) فرماتے ہیں کہ اختلاف توجیہ ہرگز جائز نہیں البتہ ردی متحرک ہو تو جائز ہے مگر فصحا کا دستور العمل بسا اوقات اس اُصول کا مخالف ہوتا ہے۔

مثلاً:

تواں صوفِ سخن را ساخت مَعلم کہ پشمِ خایہ اش نَبود بریشم

(فوقؔ یزدی)

درخشاں کرو چوں تیغ از پلالک بماہی گاؤ گفتا کیف حالک

(نظامؔ علیہ الرحمۃ)

بے فردغیکہ چوں بردمد زسیمائے مے خوارہ نیردمد

(مرزا غالبؔ علیہ الرحمۃ)

خوشا احوالِ یارانِ گذشتہ کہ جن کی زیست تھی رشکِ فرشتہ

(مرزا رفیع سوداؔ)

ان چہار اشعار میں ماقبل ردی کی حرکات میں اختلاف ہے حالانکہ رَدی ساکن ہے۔

(۳) عروضی متفق ہیں کہ حرفِ مکتوبی کا قافیہ اس غیر مکتوبی کے ساتھ جو تلفظ میں ہو 'درست نہیں ہے مگر اساتذۂ حال اس اُصول کے پابند نہیں ہیں۔ چنانچہ حضرت امیر اللہ تسلیم دام فیضہٗ فرماتے ہیں:

قید اپنا وہ آپ پُر فن تھا حلقۂ زُلف طوقِ گردن تھا
عذر مانع نہ تھا کوئی تسلیم ترکِ شعرو سخن یہ قصداً تھا

اور برقؔ مرحوم فرماتے ہیں:

یار مَن مَن کے بگڑ جاتا ہے کام بن بن کے بگڑ جاتا ہے
یہ ترا ڈر ہے کہ بوسوں کا کھیل ادبا بن کے بگڑ جاتا ہے

غرضیکہ اس قسم کی صدہا مثالیں اساتذہ کے کلام میں ملتی ہیں جن کو متقدمین اور متاخرین کی دواوین وقصائد پر عبور ہے وہ ان باتوں کو بخوبی جانتے ہیں۔ بعض شعرا نے صلاح اور راہ' اغیاث اور اداس کا قافیہ باندھا ہے اور خواجہ حافظ شیرازی علیہ الرحمۃ نے توردی کو ایک مصرع میں متحرک اور ایک میں ساکن بھی لکھ دیا ہے۔ قافیہ تو ایک طرف بعض اساتذۂ لکھنو نے ردیف میں بھی بڑی آزادی سے کام لیا ہے۔ چنانچہ شیخ ناسخؔ مغفور فرماتے ہیں:

کردیئے خط نے ترے عارضِ پُر نور سیاہ ہوگیا مشک کی مانند یہ کافور سیاہ
پاس جو بیٹھ کے پڑھتے تھے غزل وہ گئے دن اب تو ناسخ کبھی کر آتے ہیں وہ دور سے آہ

حقیقت یہ ہے کہ زبان کے اُصول اساتذہ کے کلام سے مستخرج ہوتے ہیں جو کچھ اکابر

شعرا کے کلام میں آ گیا ہے۔ وہی سب کا دستور العمل ہونا چاہئے۔ شیخ مصحفی علیہ الرحمۃ کیا خوب فرماتے ہیں:

حاصل ہے زمانے میں جنہیں نظمِ طبیعی　　نظم ان کی کے اشعار بہ از آب رواں ہیں

پرواہ انہیں کب ہے ردیف اور ردی کی　　کب قافیہ کی قید میں آتشِ نفساں ہیں

مجھ کو تو ردیف آتی ہے نہ قافیہ چنداں　　اک شعر سے گرویدہ مرے پیر و جواں ہیں

اعتراضِ پنجم

ہاتھ اے مفلسی صفا ہے ترا　　ہائے کیا تیر بے خطا ہے ترا

آپ کو صفا بمعنے صاف کے جواز میں تامل میں ہے مگر آپ کو یہ معلوم نہیں کہ اہل زبان کے تصرفات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بسا اوقات مصدر کو بمعنے اسم فاعل استعمال کرتے ہیں۔ جس طرح اُردو والوں نے صفا (مصدر) کو صاف کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اسی طرح اساتذۂ پارس نے مصدر زوال کو بمعنے زائل کنندہ استعمال کیا ہے حکیم افضل الدین خاقانی خلیفہ بغداد کی تعریف میں فرماتے ہیں:

ع ابرِ انعامش زوالِ قحط قحطان آمدہ

علی ہذا القیاس کبھی حال کو اسم فاعل کے معنوں میں (مستانہ بمعنے مست) بولتے ہیں۔ مثلاً: ''ادھر دیوانہ جاتا ہے ادھر مستانہ آتا ہے'' (داغؔ) اگر صفا بمعنے صاف کے استعمال میں کلام ہو تو حضرت داغؔ دام فیضہٗ کا یہ مطلع ملاحظہ فرمائیے:

آئینہ منہ پہ بھلا اور برا کہتا ہے
سچ ہے یہ صاف جو ہوتا ہے صفا کہتا ہے

دہلی مرحوم کی زبان پر اعتبار نہ ہو تو میر انیسؔ علیہ الرحمۃ کا یہ مصرع ملاحظہ ہو:

ع بت توڑ کے کعبے کو صفا کر دیا کس نے؟

البتہ ظفرؔ کا یہ شعر قابل اعتبار نہیں ہے کیوں یہ صفا بمعنے صاف بترکیبِ فارسی بندھا ہے اور فارسی میں صفا بمعنے صاف مستعمل نہیں ہے:

وہ آئینہ ہے کہ جس کو ہے حاجت سیماب
اک اضطراب ہے کافی دل صفا کے لئے

اعتراض ششم

شورِ آوازِ چاک پیراہن　　لب اظہارِ مدعا ہے ترا

اس شعر میں ایک نازک بات تھی مگر افسوس آپ نے تدبر نہ کیا اور یہ اعتراض کر ہی دیا کہ شور لب کیوں کر بن گیا۔ میناخانۂ خیال کے تماشائی ہو کر ایسی جنبشِ مژگاں سے رنگِ تماشا کو ''توڑنا'' مناسب نہ تھا۔ اقبال بیچمدان عرض کرتا ہے کہ لب اظہار میں اضافتِ بیانی ہے آپ کا اعتراض صحیح ہوتا اگر لبِ اظہار سے حقیقی لب مراد لی جاتی۔ ہاں اضافتِ بیانی کی سند چاہو تو حاضر ہے:

شیخ علی حزین علیہ الرحمۃ: صفِ مژگانِ تو گر عکس بدریا فگند: خار قلاب بود و بدن ماہیٔ ما

مرزا غالب علیہ الرحمۃ: کمال گرمیٔ سعیٔ تلاشِ دید نہ پوچھ: برنگ خار مرے آئینے سے جوہر کھینچ

پس جب ''ماہیٔ ما'' اور ''میرے آئینہ'' سے ''میں'' مراد ہو سکتی ہے تو لبِ اظہار سے اظہار کیوں مراد نہ ہو اور اظہار اور شور میں جو مناسبت ہے وہ ظاہر ہے لیکن مجھے اُمید نہیں کہ آپ اس توضیح کو قبول کریں ایک اور تشریح پیش کرتا ہوں شائد سمع قبول سے شرف اندوز ہو۔ شور کو لب کے ساتھ اظہار میں مشارکت ہے پس یہ استعارۂ بے تکلف اور استعارۂ بے تکلف تمام فصحاء کے نزدیک جائز ہے۔ علم معانی کا کوئی چھوٹا سا رسالہ لے کر پڑھیے۔ اس میں بھی اس قسم کے استعارے کو جائز لکھا دیکھیے گا۔ قطع نظر اس بات کے آپ خوب جانتے ہیں کہ استعارے کا میدان وسیع ہے۔ شاعر اہلِ زبان کے محاورات کا پابند ہوتا ہے۔ اور یہ پابندی ضروری ہے۔ لیکن اہل زبان کے تخیلات کی پابندی ضروری نہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ اگر متقدمین نے گلشنِ طور لکھا ہے تو ہم بھی گلشنِ طور ہی لکھا کریں۔ جس شخص نے ملا ظہوری پر یہ اعتراض کر دیا تھا کہ ''آتش بیگانہ'' مسموع نہیں ہے میری رائے میں وہ غلطی پر تھا کیوں کہ ظہوری کا تخیل ایرانیوں کے تخیل کا مقلد نہیں ہو سکتا۔ اسی خیال سے مرزا بیدل علیہ الرحمۃ نے فارسیوں کی پروا نہ کر کے ''خرام کاشتن'' (ہر گاہ دو قدم خرام می کاشت) لکھ دیا اور نافہموں نے اُن کی آزادیٔ تخیل کو سہامِ اعتراض کا نشانہ

بنایا۔ متقدمین میں سب ناصر علی سرہندی علیہ الرحمۃ اور مرزا جلالؔ اسیرؔ بھی ان قیود سے آزاد ہیں۔ خواجہ آتشِ مرحوم ''گرگ بغل'' تحریر فرماتے ہیں اور حضرت امیرؔ مرحوم کے اشعار سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

ع میں بارِ خاطرِ قفس وآشیاں نہیں

غالباً ''گرگ بغل'' اور ''خاطر قفس'' کا استعارہ آپ کسی ایرانی یا اُردو شاعر کے کلام میں نہ پائیں گے، پس میری رائے میں استعارے پر اعتراض کرنے کا حق کسی محقق کو حاصل نہیں الاّ اس صورت میں جب کہ استعارہ اصلیت سے معرّا ہو۔ باوجود اس تشریح کے مجھے پھر بھی خیال ہے کہ آپ مذکورۂ بالا رائے کو تسلیم کرنے میں ضرور تامل کریں گے۔ اس واسطے میں اپنے استعارے کی تائید میں شیخ علی حزین علیہ الرحمۃ کا ایک شعر پیش کرتا ہوں۔ جس طرح میں نے لب سے مراد آواز لب یا گفتار لی ہے اسی طرح شیخ علیہ الرحمۃ اپنے شعر میں ناقوس سے مراد آوازِ ناقوس لیتے ہیں:

سرِ کافر شدن داریم کو بت خانۂ عشقے
کہ ناقوسش بجاے نغمۂ یاحی شود مارا

اس سند پر بھی آپ اپنے اعتراض کی غلطی کو تسلیم نہ کریں تو آپ کی مرضی۔ میری رائے میں تو اس قسم کے استعارے کی تائید میں اس شعر سے بڑھ کر اور کوئی سند نہیں ہوسکتی۔ ماشاء اللہ آپ ایک تعلیم یافتہ اور محقق آدمی ہیں مجھے یقین ہے کہ آپ سررشتۂ انصاف کو ہاتھ سے نہ دیں گے۔

اعتراض ہفتم

اس جہاں میں اک معیشت اور سو افتاد ہے الخ

آپ کے رائے میں یہاں ''سو افتاد'' کی جگہ ''سو افتادیں'' ہونا چاہئے مگر آپ اعتراض کرنے سے پہلے یہ سوچتے کہ الفاظ دس۔ سو۔ ہزار۔ لاکھ۔ سینکڑوں اُردو زبان میں واحد تصور کئے گئے ہیں اس واسطے ان کا معدود واحد ہوسکتا ہے اور فصحا نے واحد استعمال کیا ہے۔ آپ لکھنوی ہیں یا لکھنؤ کی زبان کے مقلد ہیں اس واسطے میں سند میں اساتذۂ لکھنو کے اشعار پیش کرتا ہوں:

خواجہ حیدر علی آتش مرحوم:

مشقِ ناوک افگنی کرتا تھا جب وہ ماہرو　　سینکڑوں ہی تودۂ خاکسترِ پروانہ تھا

شیخ ناسخ مغفور:

تھی نہ امید رہائی کی دلِ ناسخ کو　　لاکھ زنجیر ترے گیسوئے خمدار کی تھی

حضرت تسلیم دام فیضہٗ:

خال ومژگان کے عشق سے دل میں　　سینکڑوں داغ لاکھوں روزن تھا

حضرت جلال مدظلہٗ:

نظر آتے نہیں مجھ کو وہ دس منزل میں رہتے ہیں　　مری آنکھوں کی پتلی میں، نگہ میں، تل میں رہتے ہیں

اعتراض ہشتم

ع　مدت سے آرزو تھی کہ سید ہا کرے کوئی

معلوم نہیں آپ کا اعتراض اس مصرع کی زبان پر ہے یا مفہوم پر۔ ''سید ہا کرنا'' کے معنے یہاں وہی مراد لئے گئے ہیں جو میر ممنون دہلوی کے اس شعر میں ہیں:

تیرے قامت نے کیا خوب ہی سید ہا اس کو　　سرو گلشن کو بہت دعویٰ رعنائی تھا

اگر آپ یہ کہیں کہ اس محاورے کا اطلاق اپنی ذات پر نہیں ہوسکتا تو صحیح نہیں کیوں کہ ظفر مرحوم کا مطلع ہے:

عشق میں کیا ہم ہی اے تقدیر سیدھے ہوگئے
کتنے اس قالب میں ٹیڑھے تیر سیدھے ہوگئے

اصل میں سید ہا کرنا فارسی محاورہ راست کردن کا ترجمہ ہے اور یہ محاورہ صوفیائے کرام کے اشعار میں بکثرت پایا جاتا ہے۔

یہی وہ راستی ہے جو عشق کی حرارت سے پیدا ہوتی ہے اور جس کا اثر سکندر کے آئینے کو جمشید کا جامِ جہاں نما بنا سکتا ہے۔ حرمان نصیب اقبال کو اسی راستی کی آرزو ہے۔ مگر افسوس آپ نے اس تمنائے محمود کو مذموم تصور فرمایا!! کاش آپ اس رمز سے آگاہ ہوتے! ہاں! میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس مصرع میں پہلوئے ذم ضرور ہے۔ اور پہلوئے ذم کس اُستاد کے کلام میں نہیں؟ حضرت جلال لکھنوی فرماتے ہیں ع ''سلامت رہو کیا لگائی ہے ٹھوکر'' اور میر تقی علیہ الرحمۃ

فرماتے ہیں ۔ع ''ہے راہ تنگ ایسے جیسے سوئی کا ناکہ'' اور ملوؔل لکھنوی کا مصرع تو سب کو معلوم ہے ۔ دیگر اساتذہ کے کلام میں بھی کئی مثالیں پہلوئے ذم کی موجود ہیں ۔ مگر میں انہیں نظر انداز کرتا ہوں ۔ آپ خود انصاف کریں کہ بڑے بڑے فصحا اس سے نہیں بچ سکے تو اقبالؔ کی کیا حقیقت ہے! اصل بات یہ ہے کہ کسی شعر یا عبارت کا ایسا مفہوم سمجھنا پڑھنے والے کی اپنی طبعیت پر منحصر اور اس کے اندرونی خیالات کے میلان کا نتیجہ ہوا کرتا ہے ۔ مرزا بیدلؔ علیہ الرحمۃ والغفران فرماتے ہیں اور کیا خوب فرماتے ہیں:

میوہ و نقل و ترشح ہر یکے بار است وبس لیک می باید بہر موقع جدا فہمد کسے
تار در ہر جا مقام ساز گردیدست صرف طبع گر روشن بود ظلمت چرا فہمد کسے

میں نے اپنے فہم قاصر کے مطابق آپ کے تمام اعتراضات کا جواب دیدیا ہے ۔ البتہ ''میں نے'' پر جو اعتراض آپ نے کیا ہے وہ صحیح ہے ۔ چوں کہ یہ محاورہ مخصوصات پنجاب میں سے ہے ۔ اس واسطے میں اُس کی تائید میں کوئی شعر فصحائے دہلی ولکھنؤ کے کلام میں سے پیش نہیں کرسکتا ۔ لیکن اتنا عرض کئے دیتا ہوں کہ جس نظم کے شعر پر آپ نے یہ اعتراض کیا ہے اس میں بعض اور بھی پنجابی الفاظ و محاورات استعمال کئے گئے تھے معلوم نہیں آپ کی حرف گیری اس محاورے تک کیوں محدود رہی ۔ بہر حال میں اِس لغزش کو تسلیم کرتا ہوں ۔ اور اسکی وجہ یہ ہے کہ پنجاب میں یہ محاورہ زبان زد عام ہے ۔ اور شب و روز سنتے سنتے بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بے احتیاطی میں زبان یا قلم سے نکل جاتا ہے مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ پنجاب میں پڑھے لکھے آدمی اُردو کے مستند محاورے سے جس میں ''میں نے'' کے بجائے ''مجھ کو'' استعمال ہوتا ہے ۔ ناآشنا ہیں ۔ میرے اشعار بہت سے موجود ہیں جن میں اس محاورہ کا صحیح استعمال ہے ۔

میں آپ کا مشکور ہوں کہ آپ کے مضمون سے میری طبعیت تحقیق کی طرف مائل ہوئی اور کیا تعجب ہے کہ میرا جواب آپ کی طبعیت پر بھی یہی اثر کرے ۔ آپ مطمئن رہیں مجھے اساتذہ کی ہمسری کا دعویٰ نہیں ہے اگر اہل پنجاب مجھ کو یا حضرت ناظرؔ کو بہمہ وجوہ کامل خیال کرتے ہیں اُن کی غلطی ہے زبان کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے اور یہ ایک ایسی دشوار گذار وادی ہے کہ بالخصوص ان لوگوں کو جو اہل زبان نہیں ہیں یہاں قدم قدم پر ٹھوکر کھانے کا اندیشہ ہے ۔ قسم بخدائے لایزال میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ بسا اوقات میرے قلب کی کیفیت اس قسم کی ہوتی ہے کہ میں باوجود

اپنی بے علمی اور کم مائگی کے شعر کہنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ ورنہ مجھے نہ زبان دانی کا دعویٰ ہے نہ شاعری کا۔

راقم مشہدی میرے دل کی بات کہتے ہیں:

نیم من در شمارِ بلبلاں امّا بایں شادم
کہ من ہم درگلستانِ قفس مشتِ پرے دارم

☆☆☆☆☆

(ماخوذ از مضامین اقبال مرتبہ تصدق حسین تاج، مطبوعہ تصدق حسین تاج مطبوعہ احمدیہ پریس، چار مینار، حیدرآباد دکن ۱۳۶۲ھ بارِ اول)

☆☆☆☆☆

مری مشّاطگی کی کیا ضرورت حُسنِ معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالہ کی حنا بندی

.....

مجھے خبر نہیں یہ شاعری ہے یا کچھ اور
عطا ہوا ہے مجھ کو ذکر و فکر و جذب و سرور

.....

علاّمہ اقبال

زبانِ اُردو

(ترجمہ)

ڈاکٹر وائٹ برجنٹ صاحب نے جن کو السنہ مشرقیہ کے ساتھ بالخصوص دلچسپی ہے۔ انگریزی زبان میں ایک مختصر سا مضمون اُردو زبان پر لکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کا علم و فضل ہماری تعریف کا محتاج نہیں۔ ان کی عالمانہ گفتگو اور وسیع ہمدردی کو اگر صیادِ خلق کہا جائے تو ہر طرح سے زیبا ہے۔ اس مضمون کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ اُردو زبان کے بانکپن نے مغربی فضلاء کو بھی اپنا گرویدہ کرلیا ہے۔ ہماری درخواست پر ہمارے دوست شیخ محمد اقبال صاحب یم اے جنہیں اس مضمون کی کاپی ڈاکٹر صاحب موصوف نے تحفۃً دی تھی۔ اسے ناظرین کے لئے ترجمہ کر کے بھیجتے ہیں۔ (مخزن ستمبر ۱۹۰۴ء)

اُردو زبان کی ابتداء شہنشاہ اکبر (۱۵۵۶۔۱۶۰۵) کے عہد سے ہوئی ہے ہمایوں کے عہد میں سلطنت مغلیہ پنجاب اور مضافاتِ دہلی و آگرہ تک ہی محدود تھی مگر اکبر کی ذکاوت اور اس کی قوتِ انتظام نے اس چھوٹے سے علاقے کو ایک عظیم الشان سلطنت بنا دیا جو کابل اور قندہار کی سرحد سے شروع ہو کر اڑیسہ اور حدودِ آسام تک پہنچتی تھی اس کا دارالخلافت کبھی شہر دہلی ہوا کرتا تھا اور کبھی آگرہ اور اور ان شہروں کے درمیان اضلاع کی زبان مغربی ہندی کی ایک شاخ تھی جس کو برج بھاشا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ غالب خیال یہ ہے کہ اکبر کے عہد تک مسلمان بھی ہندوؤں کے ساتھ میل جول کرنے میں یہی برج بھاشا بولا کرتے تھے۔ مگر شہنشاہِ مذکور کی زمانے سے اس تغیر کا آغاز ہوتا ہے جس کا نتیجہ بالآخر یہ ہوا کہ ضرورت نے ایک نئی زبان پیدا کردی۔ اکبر کے کئی وزراء بالخصوص وزیر صیغۂ مال ہندو تھے جن کو تقاضائے وقت کی وجہ سے اس وقت کی درباری زبان یعنی فارسی سیکھنی پڑی۔ جس طرح انگلستان میں شاہانِ نارمن کے عہد سے انگلوسکسن اور نارمن فریخ کی آمیزش سے انگریزی زبان کا آغاز ہوتا ہے۔ اسی طرح

ہندوستان میں فاتحوں اور مفتوحوں کی زبانوں کی آمیزش سے یا یوں کہو کہ فارسی اور برج بھاشا کے ازدواج سے اُردو زبان پیدا ہوتی ہے۔ فارسی بولنے والے مسلمان سپاہی کو روزمرہ کے کاروبار میں دہلی اور آگرہ کے باشندوں کے ساتھ برتاؤ کرنا پڑتا تھا۔ اس آمیزش کے اور بھی مد ہوئے۔ یہاں تک کہ ہندی مفری (مفرّس)۔ قشونِ شاہی (شاہی افواج) یعنے اُردوئے معلیٰ کے نام پر اُردو کہلانے لگی۔

حکومتِ مغلیہ کی توسیع کے ساتھ ساتھ شمالی اور کسی حد تک جنوبی ہندوستان میں بھی تعلیم یافتہ لوگوں میں اس زبان کی ترویج ہوتی گئی اور ہندوستانی مسلمان مصنفین کی فارسی تواریخ واشعار کے ساتھ اس نئی زبان کا علم ادب بھی ترقی کرتا گیا۔ دوصدیوں تک تو یہ علم ادب صرف مذہبی اور عاشقانہ نظموں تک ہی محدود تھا۔ جن کے مطالعہ سے زبان کی تدریجی نشوونما کا سراغ ملتا ہے۔ لیکن سولہویں صدی کے اختتام سے پیش تر مسلمان شعراء کی طبع آزمائیاں شروع ہوتی ہیں۔ اگرچہ ان کا عروض اور ان کی زبان زیادہ تر ہندی اصل کی ہیں۔ ۱۶۰۰ء کے قریب اُردو شعرا فارسی بحور کا استعمال شروع کرتے ہیں اور رفتہ رفتہ فارسی الفاظ ومحاورات اُردو زبان میں کثرت سے داخل ہوتے جاتے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے اختتام کے قریب (۱۷۹۰) اُردو نثر کا پہلا نمونہ یعنے شیخ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ قرآن شریف شائع ہوتا ہے۔ مگر چوں کہ اس کے مصنف نے عربی محاورات والفاظ واستعارات کی اندھادھند تقلید کی ہے اس واسطے یہ ترجمہ تصانیف ادبیہ میں شمار کئے جانے کا مستحق نہیں ہے۔

آخر انیسویں صدی کے شروع میں اُردو مصنفین نے یہ محسوس کیا کہ نثر اظہار خیالات وتاثرات قلبی کا ایک موزوں آلہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو نثر کے نشوونما میں ایک بے جا تعویق لاحق ہوئی ہے۔ تاہم یہ تعویق اپنے فوائد سے خالی نہیں رہی۔ مسٹر بیمز فرماتے ہیں۔

''بدقسمتی سے قریباً ہر ہندوستانی زبان کا یہی حال رہا ہے کہ جب مصنفین نے اس زبان میں لکھنا شروع کیا تو ان کی طرزِ تحریر سے قدرتی رنگ معدوم ہوگیا اور تصنع اور بناوٹ نے یہاں تک زور پکڑا کہ متاخرین نے متقدین کی طرزِ تحریر کو بغیر کسی تبدیلی کے اختیار کرلیا''۔ لیکن اُردو زبان اس قید سے مستثنیٰ تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض فارسی تصنعات کی تقلید سے اسے نقصان پہنچا' تاہم یہ صحیح ہے کہ اُردو نثر نویسوں نے بالعموم ایسی طرزِ تحریر اختیار کی جو وقت کے تقاضے سے خود بخود پیدا ہوئی۔ اور جو بناوٹ سے آزاد ہونے کی وجہ سے عوام کے فہم اور سمجھ کے

عین مطابق تھی۔

موجودہ صدی میں اردو نثر کی ترقی کے تین بڑے قوی اسباب ہوئے ہیں ۔اوّل چھاپہ خانہ کی ترویج جو مسیحی واعظوں بالخصوص سیرام پور کے واعظوں کی وساطت سے ہوئی۔ دوّم زبانِ انگریزی کی تعلیم جو ۱۸۳۲ء سے مسیحی واعظوں اور بالخصوص ڈف صاحب کے مساعی جمیلہ سے شروع ہوئی۔اور جس نے ہندوستان کی زبانوں پر مغربی علمی خزائن کے دروازے کھول کر ان پر وہ احسان کیا جو گم شدہ یونانی علم ادب کے دریافت نے یورپ کی زبانوں پر کیا تھا۔مغربی علوم وفنون کی ہوا نے اردو زبان میں ایک نئی روح پھونک دی ہے اور شائد ہندوستان کی کوئی اور زبان اس مغربی اثر سے اس قدر متاثر نہیں ہوئی جس قدر کہ یہ زبان ہوئی ہے۔سوئم اردو زبان کا فارسی کے بجائے درباری زبان قرار دیا جانا۔اس واقعہ کے اثر نے پٹنہ اور پشاور کے درمیان ممالک کو اردو کے زیر نگین کر دیا ہے۔اور چونکہ دہلی اور آگرہ کو اب دارالخلافہ ہونے کا شرف نہیں رہا اس واسطے زبانِ مذکور کی ادبی تحریکات کے مرکز لاہور اور الہ آباد قرار پا گئے ہیں۔

اردو کی ماں یعنی برج بھاشا کا اثر تو دہلی اور آگرہ تک ہی محدود تھا مگر بانکی بیٹی کو خدا نے وہ شرف بخشا کہ آج شمالی ہندوستان میں تین لاکھ مربع میل پر اس کا دَور دَورہ ہے بلکہ جنوبی اور مغربی ہندوستان کے بعض وسیع اضلاع بھی اس کی حکومت سے آزاد نہیں۔اس کے علاوہ کئی مقامات میں مقامی بولیوں کے علاوہ اردو گویا زبان ثانی تصور کی جاتی ہے جس کی وجہ سے اردو بولنے والوں کی تعداد کا صحیح اندازہ کرنا نہایت مشکل ہے۔باوجود اس اشکال کے ہم گریرسن صاحب کی تحقیقات کے مطابق زبانِ مذکور کے بولنے والوں کی تعداد درج کرتے ہیں۔اور صاحب موصوف کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے ازروئے کرم ہمیں اپنا مسودہ عطا فرمایا۔

پنجاب	۵۸۹۶۱۱
صوبہ جاتِ متحدہ اوراودھ	۳۴۸۶۳۶۰
بنگال	۱۶۷۲۴۸۸
راجپوتانہ وغیرہ	۵۲۹۰۸۹
ممالک متوسط	۱۵۵۰۱۴

حیدرآباد.....۲۷۰۴۰۰

بمبئی.....۱۳۰۱۲۲۲

میزان.....۸۰۰۴۱۸۳

مدراس کے اُردو بولنے والوں کی تعداد اس تعداد میں کچھ بہت بڑا اضافہ نہیں کر سکتی لہذا مندرجۂ بالا تعداد کم و بیش ہندوستان کے خالصِ اُردو بولنے والوں کی سمجھی جانی چاہئے۔ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ جزئی طور پر اُردو زبان کی وسعت ان حدود سے وسیع تر ہے۔ مثلاً پنجاب کے ایک کروڑ مسلمان باشندوں اور ایک کروڑ ۵۵ لاکھ مسلمان بنگالی بولنے والوں کے درمیان اُردو جز اُمروج ہے۔ مزید برآں مندرجۂ بالا ۸۰ لاکھ اُردو بولنے والوں میں غالباً لکھ پڑھ سکنے والوں کی تعداد شائد اس قدر ہے کہ کسی اور دیسی زبان کے بولنے والوں میں اس قدر نہ ہوگی۔ یہی حال اُن لوگوں کا ہے جو اُردو کو بطور زبانِ ثانی استعمال کرتے ہیں۔ ان لوگوں میں سے اکثر مثلاً اہل پنجاب نے اُردو مدرسوں میں پڑھ کر سیکھی ہے۔

بعض مغربی مصنفین کی رائے ہے کہ اُردو ہندی سے کوئی الگ زبان نہیں ہے کیوں کہ اس کی صرف ونحو کلیتہ ہندی اصل کی ہے۔ بمیز صاحب فرماتے ہیں کہ اُردو کو ہندی زبان سے متمیز تصور کرنا غلطی ہے۔ اگرچہ ہندی بولنے والے مقامات میں مقامی بولیوں کے درمیان بہت سا اختلاف ہے۔ تاہم ایک عام مشترک بولی متعارف ہے جس کو تمام تعلیم یافتہ لوگ استعمال کرتے ہیں۔ اس مشترک بولی کی ابتداء مضافاتِ دہلی سے ہوئی اور ہندی کی وہ شکل جو اس شہر کے گردونواح میں بولی جاتی تھی رفتہ رفتہ ایک نئی زبان سمجھ کر اختیار کر لی گئی''۔ بمیز صاحب ٹھیک فرماتے ہیں مگر وہ اس امر کو نظر انداز کرتے ہیں کہ اس نئی زبان کا اختیار کیا جانا ہی گویا اُردو زبان کی ابتداء تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو برج بھاشا شمالی مغربی ہندوستان کے ایک تھوڑے سے حصہ تک ہی محدود رہتی اور اس کی حیثیت ایک معمولی مقامی بولی کی حیثیت سے بڑھ کر نہ ہوتی۔ ڈاکٹر ہارنلی نے ٹھیک کہا ہے کہ اُردو برج بھاشا کی ایک تبدیل شدہ صورت ہے جس نے بھاشا کی گردانوں کے اُلجھاؤ سے اپنے آپ کو آزاد کر لیا ہے اور بعض صیغے جب پنجابی اور مارواڑی کے ساتھ مختص ہیں رکھ لئے ہیں۔ پس اُردو بلحاظ صرف ونحو کے ہندی الاصل ہے جس میں کچھ مارواڑی اور پنجابی

اجزاء بھی شامل ہیں اور بلحاظ الفاظ و اصطلاحات کے اس کی اصل کچھ ہندی ہے اور کچھ فارسی و عربی وغیرہ بلکہ اس کے مصنفین نے کئی غیر ملکی محاورات کا ہندی ترجمہ کر کے اپنی زبان کے ذخیرہ محاورات کو زیادہ کیا ہے مثلاً محنت کھینچنا، پھل لانا وغیرہ جو محنت کشیدن اور بار آوردن کا ترجمہ ہیں۔ کتابی ہندی کی تو ابتدا ہی اس صدی سے ہوتی ہے۔ یہ گویا اس اثر کا نتیجہ ہے جو انگریزی تعلیم نے زمانہ حال کے ہندوؤں پر کیا ہے اگرچہ حقیقت میں یہ کتابی ہندی وہی اردو ہے جس میں غیر ملکی الفاظ و محاورات کی جگہ تصنع سے ہندی محاورات اور سنسکرت کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندی زبان بولنے والے ممالک کے تعلیم یافتہ ہندو کتابی ہندی کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں اور برج بھاشا بولنے والے اس کے فہم سے عاری ہیں۔ ہمارے نزدیک ڈاکٹر بارنل نے جو اردو مشرقی ہندی اور مغربی ہندی میں امتیاز کیا ہے بالکل صحیح ہے۔ اور اردو مشرقی اور مغربی ہندی سے اس طرح متمیز ہے جس طرح انگریزی ڈچ اور جرمن سے۔

فی زمانہ انگریزی زبان کی طرز تحریر اردو زبان پر بہت بڑا اثر کر رہی ہے۔ موجودہ اردو اخبارات اور تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی بولی انگریزی زبان کے الفاظ و محاورات سے معمور ہوتی ہے۔ اگرچہ مستند اردو مصنفین کی تحریروں میں انگریزی الفاظ و اصطلاحات کو چنداں دخل نہیں ہے۔ تاہم بہت سے الفاظ آہستہ آہستہ ان کی تحریروں میں آتے جاتے ہیں (مثلاً توبتہ النصوح کے مصنف نے الفاظ انٹرنس۔ البم۔ فری میسن۔ ربڑ۔ پنسل۔ ڈاکٹر وغیرہ کو استعمال کیا ہے) اور ان کی طرز تحریر اور لکھنے کا ڈھنگ انگریزی طرز ادا سے متاثر ہوتا جاتا ہے۔ اس اثر کا نتیجہ خود واضح ہو جائے گا۔ بیمز صاحب اس امر کے متعلق یوں پیش گوئی کرتے ہیں:۔

> غالب گمان یہ ہے کہ ریلوں سڑکوں اور دیگر وسائل آمد و رفت کی توسیع سے پنجابی اور راجپوتانہ کی دیگر مقامی بولیاں معدوم ہو جائیں گی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اٹک سے راج محل تک اور ہمالہ سے وندھیاچل تک ایک ہی زبان ہندی مفرس یعنے اردو کا دور دورہ ہو جائے گا۔ اس وقت اس زبان کو بولنے والوں کی تعداد دس کروڑ سے بھی زیادہ ہوگی اور یہ زبان اپنی عظیم الشان وسعت اور روز افزوں وقعت کے باعث اپنی ہمسایہ زبانوں پر بھی ایک بہت بڑا اثر ڈالے بغیر نہ رہے گی جوں جوں مقامی اتحاد کے وسائل اور ملک کے مختلف حصص کے تعلقات بڑھتے جائیں گے توں توں یہ سادی، شستہ، بانکی

اور ہر قسم کے مطالب کو ادا کر سکنے والی اردو زبان جو ہندوستان کے اکثر حصّوں میں بولی جاتی ہے اور جو حکمران قوم کو انگریزی زبان کے ساتھ خاص تشابہ رکھنے کے باعث بالخصوص مرغوب ہے ہندوستان کی اکثر دیگر زبان پر غلبہ حاصل کرتی جائے گی اور بالآخر وہ وقت آجائے گا جب کہ تمام آریا ہندوستان کی زبان ایک ہو جائے گی'' اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو زبان اور انگریزی زبان کی تاریخ میں ایک عجیب و غریب مماثلت ہے اور ولیم کوپر شاعر انگلستان کے دلفریب الفاظ دونوں پر صادق آسکتے ہیں۔

''اے انگلستان اس مدت مزید کے بعد بھی تیری زبان پر تیرے فاتحین کا اثر نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ شستگی، بانکپن اور لطفِ ادا، اس کے خاص جوہر ہیں اور یہ خیالات والفاظ کے ان گرانمایہ موتیوں سے دمک رہی ہے جو تیرے فاتحین پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔

☆☆☆☆

ماخوذ از ''مضامین اقبال'' مرتبہ تصدق حسین تاج

مطبوعہ احمدیہ پریس چارمینار حیدرآباد دکن، حیدرآباد دکن، ۱۳۶۲ھ، بار اول

O

''میرے زیر نظر حقائق اخلاقی اور ملّی ہیں۔ زبان میرے لئے ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ بلکہ فن شعر سے بھی بہ حیثیت فن کے نابلد ہوں .....''

(مکتوب اقبال مورخہ ۲۰ر جنوری ۱۹۳۱ء بہ نام پروفیسر خواجہ ایف، ایم شجاع

اقبال نامہ۔ حصہ اول، ص ۲۱۵، ۲۱۶)

علامہ سر محمد اقبال مدظلہ

ایم اے، پی ایچ ڈی، بار ایٹ لا، ایم ایل سی، لاہور

کی

خدمت میں

انجمن ترقی اردو مدراس

کا

سپاس نامہ

[illegible]

علامہ سر محمد اقبال مدظلہٗ

(ام،اے۔پی،ایچ،ڈی۔بارسٹراٹ لا۔ام ،ال،سی۔لاہور)

کی خدمت میں انجمن ترقی اُردو مدراس کا سپاس نامہ

بروز یکشنبہ ۶ رجنوری ۱۹۲۹ء مطابق ۲۰ رر جب ۱۳۴۷ھ بمقام گھوکھلے ہال:

زِنکہتِ سحری شوق یار می خیزد
جنوں زسایۂ ابر بہار می خیزد

جناب عالی! ہم اراکین انجمن ترقی اردو مدراس اپنی طرف سے اور نیز مسلمانان جنوبی ہند کی طرف سے کمالِ جوشِ مسرت اور انتہائی جذبات انبساط و بہجت کے ساتھ آپ کا خیر مقدم کرتے ہوئے خلوصِ دل اور انشراحِ صدر سے اس امر کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ آپ کے ورودِ مسعود سے جو ہمارے تاریخی شہر مدراس میں ہوا ہے اس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک خوشی وخرمی کی ایک عظیم الشان لہر دوڑ گئی ہے اور اس کا ہر ایک فرد فرطِ مسرت سے اس طرح آپ کو مخاطب کر رہا ہے :

مرا گھر تیری منزل گاہ ہو ایسے کہاں طالع
خدا جانے کدھر کا چاند آج اے ماہرو نکلا

مدراس کے اردو علم وادب کی تاریخ میں آج کا دن وہ مبارک دن ہے کہ ہم ایک ایسی اولوالعزم ہستی کو مخاطب کر رہے ہیں جو بلحاظ علوم جدیدہ اور علوم قدیمہ ایک بے مثل اور قابل رشک ہستی ہے کیوں نہ ہو جب کہ اردو ادب آپ کے نام نامی اور اسم گرامی پر ناز کر رہا ہے اور جب کہ آپ کی فلسفیانہ اور فطرتی شاعری علم ادب کے مردہ قالب میں نئی جان ڈال رہی ہے۔

گل و بلبل بہار میں دیکھا
ایک تجھ کو ہزاروں میں دیکھا

جناب عالی! ہم اس وقت آپ کے تبحر علمی اور خاص کر آپ کے شعر وسخن کے متعلق جو کچھ بیان کریں گے وہ ہمارے دلی جذبات اور دماغی محسوسات کی ایک عکسی تصویر ہوگی' گو جناب کو اس ہمارے اظہارِ واقعی سے تنگ دلی محسوس ہوتی ہو آپ کی جدت طرازی' آپ کی نکتہ سنجی' آپ کے کلام کی متانت آپ کے شعر وسخن کی فصاحت نور' علیٰ نور کا مصداق ہو رہی ہے اور آپ کی فطرتی شاعری سب پر طرّہ ہے۔ نفس الامر یہ ہے کہ یہ ساری چیزیں ہر شاعر کو نصیب نہیں ہو سکتیں۔ آپ کی نظمیں جو دلوں کو ہلانے والی اور سوتی قوموں کو جگانے والی ہیں اور جن کا شہرہ دور دور کے شہروں بلکہ اجنبی ممالک تک پہنچ چکا ہے' فلسفیانہ مذاق سے مملو اور تصوفانہ رنگ سے رنگین نظر آ رہی ہیں۔ یہی نہیں کہ آپ نے اردو ادب کی آبرو بڑھا دی ہے اور اردو شاعری کو ترقی کی زینہ پر چڑھا دیا ہے بلکہ آپ نے مغربی فلسفہ کی خاک چھان کر اس کے عمیق اور دقیق مسائل کو حل کر دیا ہے اور اسلام کی صداقت کو مغربی فلسفہ دانوں کے روبرو اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ بھی آپ کی لیاقت ادبی اور آپ کے پرزور قلم کا لوہا مانے بغیر نہیں رہ سکتے۔

حرم و دیر میں ہے جلوۂ پُرفن تیرا
دو گھروں کا ہے چراغ مدح اِک روشن تیرا

جناب عالی! آپ کے نثر کی عبارت آرائیاں اور نظم کی معنی خیزیاں تو ایک طرف آپ کی تقریریں بھی اس پایہ کی ہوتی ہیں کہ گویا فصاحت کا دریا بہا جاتا ہے اور مضامین کی خوبیوں کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ گویا وہ ملاء اعلی سے ٹپک پڑ رہی ہیں۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسوں میں اور دوسری صحبتوں میں آپ نے جو تقریریں کی ہیں وہ ہماری اس بیان کی شاہد ناطق ہیں سچ ہے۔

تجھ سا کوئی زمانہ میں معجز بیاں نہیں
آگے تیری مسیح کے منہ میں زباں نہیں

جناب عالی! آپ کے منظوم تالیفات کی کیا تعریف کی جائے آپ کا کلام ایسا مقبول کلام ہے جس کو ہندوستان کے ادباء اور شعراء نے تاج سخن اور گوہر گراں مایہ کہا ہے بلکہ غیر ممالک کے شعراء نے بھی اس کی مدح سرائی میں کوتاہی نہیں کی ہے۔

''قبول خاطر لطف سخن خداداد است'' نہ صرف ہندوستان میں آپ کے کلام کا شہرہ ہے بلکہ یورپ میں بھی اس کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر نکانسن نے آپ کی کتاب ''اسرارِ خودی''

اور ''رموز بے خودی'' کی تعریف کے پُل باندھے ہیں اور اس کا ترجمہ بہ زبانِ انگریزی پیش کر کے آپ کی شہرت کو چار چاند لگا دئے ہیں۔ ہم حیران ہیں کہ ہم اس وقت آپ کی کس مخصوص کتاب کی خوبیوں پر روشنی ڈالیں اور اس کے کس مضمون کی نسبت اپنی خیالات کا اظہار کریں۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا است

جناب عالی! اگر آپ کو ہندوستان کا شیکسپیئر کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا اور اگر آپ کو گھیتے (گوئٹے) (جرمن شاعر) سے تشبیہہ دی جائے تو نامناسب نہ ہوگا جس طرح گیتھے نے قومی ادبار و تنزل کے وقت اپنی پُرزور نظموں سے اپنی قوم کو اُبھارا تھا اسی طرح آپ کی زبردست نظمیں قوم کو بیدار کر رہی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ کی بے نظیر نظمیں فطرت کی تصویر کھینچتی ہوئی آپ کی قوتِ ادراک اور آپ کی فطرتی جودت طبع کو ظاہر کر رہی ہیں۔ آپ جیسے فطرتی شاعر دنیا میں ہر وقت نہیں آتے اور جب آتے ہیں تو شعر و سخن کی دنیا میں ایک عظیم الشان ہل چل پیدا کرتے ہیں۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اس وقت ہم آپ کے علوم متنوعہ کے ذکر سے فارغ ہو کر آپ کے عظیم الشان کارناموں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور سب سے پہلی بات جس کا ہم ذکر کیا چاہتے ہیں یہ ہے کہ آپ نے یورپ کی مادیت کے پُرزے اڑا دئے ہیں اور اس کا بخیہ ادھیڑ کر رکھ دیا ہے۔ مادّی خیالات کے استیصال میں آپ نے اپنی نظموں میں وہ اشعار لکھے ہیں جو طلائی حروف میں لکھے جانے کی لایق ہیں۔ آج یورپ کی آزادی، آزاد پسندی اور دہریت یورپ تک محدود نہیں رہی بلکہ ہندوستان تک بھی اس کا تعدیہ زور کے ساتھ پھیل رہا ہے اور طبیعتوں میں آزادی اور خیالات میں دہریت روز افزوں ترقی کر رہی ہے۔ آج تاریک خیالات کو نئی روشنی کے نام سے پکارا جاتا ہے اور مادیت کی ضلالت کو تہذیب و شائستگی کا نام دیا جاتا ہے۔ آج یورپ کو علوم و فنون کا مرکز مان کر اس کی ہر ادا کی ریس کی جاتی ہے۔ آج یورپ کو جدید تحقیقات اور جدید خیالات کا مخزن قرار دے کر اس کے چوکھٹ پر سرِ تسلیم خم کیا جاتا ہے جو لوگ مذہبی تعلیم اور اسلامی فلسفہ سے بھی بہرہ ور ہو رہے ہیں وہ یورپ کی مادیت کی زیر اثر ہو رہے ہیں ورنہ اسلام کے آفتاب کی کرنیں قلوب کو منور کرنے کے لئے یورپی مذخرفات سے بدرجہا بہتر ہیں۔

نافہمی اپنی پردہ ہے دیدار کے لیے
ورنہ کوئی نقاب نہیں یار کے لیے

جس لکچر کا مضمون ''مسلم تھیالوجی اور ماڈرن تھاٹ'' تھا اور پھر آپ کی اعلیٰ شخصیت لکچرار کی حیثیت میں پیش ہوئی تھی اس کی نسبت یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ آپ کی زبان درفشاں سے وہ گوہر فشانی ہوئی ہے جس سے طالبان صداقت اور تشنگان راہ ہدایت مستفیض ہوئے ہیں' ایسے پُر آشوب وقت میں جبکہ دہریت کا خون رگوں میں سرعت کے ساتھ دوڑ رہا ہے' یورپ کے مادی خیالات دلوں پر قبضہ کررہے ہیں اور سوسائٹیاں اس کے زہریلے اثر سے تباہ و برباد ہورہی ہیں' جناب فخر' قوم غم خوارِ اسلام حاجی جمال محمد راؤتر صاحب دام اقبالہٗ نے اپنے دینی جوش اور وسعت قلبی سے دہریت کی تیز رفتار کا مقابلہ کرنے کے لئے کمر ہمت چست باندھ لی ہے۔ آپ نے خطبات اسلامیہ کے نام سے ایک مجلس قائم کی ہے جہاں اسلام کے مختلف پہلوؤں پر لکچر دئے جاتے ہیں۔ جن سے غرض یہ ہے کہ مادی خیالات کا استیصال ہو' اسلامی محبت ان میں جاگزیں ہو اور زنگ آلود قلوب پاک وصاف ہوں۔ اسی مجلس خطبات اسلامیہ کا طفیل ہے کہ ہم ''مذہب اسلام وجدید خیالات'' پر آپ کا دلکش اور دل فریب لکچر سنکر مستفید ہوئے ہیں۔

جناب عالی! انجمن ترقی اردو کی یہ خوش قسمتی ہے کہ آپ جیسے متبحر شخصیت کے ہاتھوں اس کی عملی کارروائی آج سے شروع ہوتی ہے۔ اس انجمن کا یہ مقصد ہے کہ جنوبی ہند کے لوگ خواہ وہ کسی قوم' کسی فرقہ کے کیوں نہ ہوں' صحیح اردو بول سکیں اور لکھ سکیں اور اس کو وہ مرتبہ دیں جو اس کو اس سے آگے حاصل رہا ہے۔ درحقیقت زبان ہی ایک ایسی چیز ہے جو قوموں کی ترقی کا باعث ہے۔ جس قوم میں ترقی یافتہ زبان کا رواج نہیں وہ ہمیشہ پستی وتنزل میں رہی ہے اور تحصیل علوم سے محروم' اس لیے کہ علم کی ترقی بغیر شائستہ زبان کے ناممکن ہے اور جب زبان ہی نہ ہو تو علم کی ترقی کیوں کر ہوسکتی ہے۔ جنوبی ہندوستان میں مسلمانوں کی خاصی آبادی ہے اور اس میں سے بہت کم لوگ ہیں جو صحیح اردو بول سکتے یا لکھ سکتے ہیں۔ یہ بات ظاہر ہے کہ اردو کی ترقی نہ ہونے کی وجہ سے اردو میں سائنٹفک کتب کا کوئی ذخیرہ نہیں اور عام مسلمان جو انگریزی زبان سے ناواقف ہوتے ہیں سائنٹفک علوم سے بے بہرہ رہتے ہیں۔ یہ وہ قومی نقصان ہے جس کی تلافی بغیر اس کے نہیں ہوسکتی کہ اردو کو ترقی دی جائے۔ شمالی ہند میں ہماری ہمسایہ قومیں اپنی زبانوں کو ترقی دینے

کے لیے ایڑی چوٹی تک زور لگا کر اس کو عام زبان بنانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اس سے نہ صرف اُن کی زبان ترقی کر رہی ہے' ان کا ادب ترقی کر رہا ہے بلکہ اس کی بدولت وہ اپنے آپ کو ترقی کے بلند زینہ پر پہونچانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اگر عربی زبان ایک کامل شائستہ اور اعلیٰ درجے کی زبان نہ ہوتی تو عربی لٹریچر میں یونان کے علمی تحقیقات کس طرح فراہم ہو سکتے تھے۔ پس یہ ضروری ہے کہ اردو کو ترقی دی جائے اور جو حضرات اس ترقی میں حصہ لیں گے وہ ضرور قومی ترقی میں ہاتھ بٹانے والے ہوں گے اور زبان اردو بھی اپنی زبانِ حال سے یوں گویا ہے۔

مجھ کو ہو تیرا تصور تجھ کو ہو میرا خیال
میں تیری تصویر کھینچوں تو میری تصویر کھینچ

جناب عالی! اس امر سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ہمارے مغربی تعلیم یافتہ نوجوان زبان اردو سے ناآشنا اور اس کے ادب سے نابلد ہیں یہاں تک کہ وہ اردو میں اپنے دلی خیالات کو پورے طور پر ظاہر نہیں کر سکتے جب تک کہ انگریزی الفاظ سے چارہ جوئی نہ ہو جو عام فہم نہیں ہوتے ۔ انگریزی میں ان کی اعلیٰ لیاقت ان کی اعلیٰ ڈگریوں سے ظاہر ہوتی ہے پلیٹ فارم پر ان کے زبردست لکچروں سے ظاہر ہوتی ہے مگر ان کی اردو لیاقت کا یہ حال ہے کہ وہ اردو کے معمولی الفاظ کو بھی صحیح طور پر استعمال نہیں کر سکتے اور یہی وجہ ہے کہ انہیں مذہبی کتب پر جو اکثر اردو میں ہوتی ہیں عبور حاصل نہیں ہوتا ۔

چاند سا چہرۂ تاباں ہے مگر اس پر بھی
زلف میں رنگ ِ شب تار نظر آتا ہے

مذکورۂ بالا ضرورتوں کے نقطۂ نظر سے انجمن ترقی اردو کی بنیاد قائم ہوئی تھی اور اس کی عملی کارروائی کا آغاز آج اس وجہ سے بھی ہوتا ہے کہ مذہبی کتب پر انگریزی خواں نوجوانوں کو عبور حاصل کرنے کا موقع دیا جائے تا کہ وہ مذہب اسلام سے پورے واقف ہو کر اسلام کی خدمت احسن طریقے پر بجالائیں اور خود اسلام کے جانثار خادم بنیں' اگر یہ حضرات اپنی فراخ حوصلگی سے اس انجمن کے ممبر بننے کے لئے تیار ہو جائیں تو بالکل قریب مدت میں وہ اردو ادب کو انگریزی ادب کا ہم رکاب بنالیں گے اور اس طرح قوم میں ادباء کا ایک بھاری اور جلیل القدر اضافہ ہو گا ۔

زر داغ جنوں تقسیم شاہ حسن کرتا ہے

تو نگر جس کو ہونا ہے وہ اس سر کار میں آئے

درحقیقت زبان اردو ایک ایسی زبان ہے جس کی بدولت مختلف مقاموں کے لوگوں میں میل ملاپ قائم ہوسکتا ہے اور آپس میں محبت ،اتحاد ، یک جہتی اور باہمی ہمدردی کے اعلیٰ جوہر پیدا ہوسکتے ہیں ورنہ اس پر قابو نہ ہونے کی وجہ سے ایک کو دوسرے کی ٹھیک خبر نہیں ہوسکتی اور نہ ایک کو دوسرے کے ساتھ اظہار ہمدردی کا موقع مل سکتا ہے اور سب سے بڑھ کر دل خراش بات یہ ہے کہ دیسی زبانوں مثلاً تامل ،تلگو، ملیالم، کنڑی میں اسلامی لٹریچر بالکل مفقود ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مذہب اسلام کی اشاعت جس طرح ہونی چاہئے نہیں ہوسکتی اور اس سے عام ناواقفیت جوں کی توں باقی رہتی ہے۔ جس قدر اسلامی لٹریچر آج اردو میں موجود ہے وہ کسی اور دیسی زبان میں نہیں پایا جاتا اور اسلام کو جو کچھ فائدے اس سے مقصود ہیں وہ خارج از تحریر ہیں انہیں بیان کرنے کے لئے وقت کی قلت مانع ہے۔ فارسی و عربی زبان کے بعد صرف اردو ہی میں مذہب اسلام کے متعلق پورا پورا ذخیرہ موجود ہے۔ قرآن مجید کی تفسیر ،احادیث ،فقہ ،صرف ونحو اور ادب اردو میں سب موجود ہیں ۔اُردو ہی سے یہ سب معلومات اور دیسی زبانوں میں حاصل ہوسکتی ہیں ۔

کس مصیبت میں پڑا ہوں میں دم تحریر شوق
وہ سما سکتا نہیں خط میں جو مضمون دل میں ہے

جناب عالی! انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد اور دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی نے مسلمانوں پر یہ بڑا احسان کیا ہے کہ وہ زبان اُردو کو کمال اُوج پر پہنچانے کی سرگرم کوششیں کر رہے ہیں، اس انتھک جدوجہد سے مغربی علوم کے سائنٹفک الفاظ کے ٹھیک ترجمے اور ان کے اصطلاحات اس میں راہ پا رہے ہیں اِن کوششوں کی بدولت اُردو زبان قریب یا بعید زمانہ میں ہندوستان کی اعلیٰ زبانوں میں شمار کی جائے گی ۔

کیمیا ہے مہربانی صاحب تاثیر کی
مَس کیا پارس نے جب آہن طلا ہوجائے گا

جب تک اردو زبان میں مغربی علوم کے الفاظ اور اصطلاحات کا کافی ذخیرہ جمع نہ ہوگا وہ اعلیٰ درجہ کی زبان کہلانے کی مستحق نہ ہوگی اور ہم اہل مغرب کا علمی میدان میں مقابلہ کرنے سے

قاصر رہیں گے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے جس قدر مغرب کا علمی سرمایہ ہمارے پاس جمع ہوگا اسی قدر ہماری زبان کو وسعت ہوگی اور ظاہر ہے کہ علمی سرمایہ مسلمانوں کی زبردست طاقت ہے اور بمصداق جہاں سے ہو اس کو حاصل کرنا ہمارا قومی فریضہ ہے مختصر یہ کہ مذہبی، قومی، اخلاقی، سیاسی اور علمی ترقی بغیر زبان کی ترقی کے ناممکن ہے۔

اثر فلک سے اُتر آ ذرا خدا کے لئے
کہ ہم نے ہاتھ اُٹھائے ہیں اب دعا کے لئے

ہم اراکین انجمن ترقی اُردو خدا کی درگاہ میں بصد عجز و نیاز یہ دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمارے معزز مہمان علاّمہ **سر محمد اقبال** دام اقبالہ کی عمر و اقبال میں ترقی دے اور انہیں آفات ارضی و سماوی سے محفوظ رکھے اور ان کے دل و دماغ کو اور زیادہ روشن کرے تاکہ وہ قومی خدمات کو اور زیادہ مستعدی کے ساتھ ادا کریں اور ہماری یہ بھی دعا ہے کہ انجمن ترقی اُردو اپنی ترقی میں کمال کو پہنچے اور مسلمانوں کے جمود کو دفع کر کے انہیں بیدار کرنے میں کامیاب ہو۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد۔

☆☆☆☆☆

خوش آ گئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے، شاعری کیا ہے!

علامہ سر محمد اقبال مدظلہ

کا

ورود مسعود

جناب علامہ سر محمد اقبال مدظلہ بروز شنبہ (سنیچر) ۵ جنوری سنہ ۱۹۲۹ء کو بمبئی میل سے سات بجے صبح تشریف لاتے ہیں۔

جمیع مسلمانان مدراس سے درخواست ہے کہ سنٹرل اسٹیشن پر آپکے استقبال کیلئے کثیر تعداد میں تشریف لائیں اور گرمجوشی سے آپکا خیر مقدم کریں

علامہ سر محمد اقبال دام ظلہ

کی

اردو تقریریں

گوکھلے ہال واقع ارمینین اسٹریٹ جارج ٹون میں ٹھیک صبح دس بجے انجمن ترقی اردو مدراس کی طرف سے علامہ صاحب موصوف کی خدمت میں اردو سپاسنامہ پیش کیا جائیگا اور آپکی تقریر ہندوستان کی عالمگیر زبان پر ہوگی۔

گیارہ بجے اسی مقام پر انجمن حمایت اسلام یتیم خانہ اسلام کی دوسالہ جلسۂ عام زیر صدارت علامہ صاحب موصوف منعقد ہوگا اور آپکی تقریر "اسلام اور دنیا" کے عنوان پر ہوگی۔ صرف یہی دو تقریریں اردو میں ہونگی۔ گوکھلے ہال کا بہترین حصہ انجمن ترقی اردو اور انجمن حمایت اسلام کے اراکین کیلئے مخصوص ہوگا اور جو احباب ان میں سے کسی ایک انجمن کے رکن بنکر ایک روپیہ نقد ادا کرینگے وہ اس مخصوص مقام پر بشرط گنجائش بیٹھ سکینگے۔ انجمن حمایت اسلام کے اراکین کے ٹکٹ ۵۳ والاجاہ روڈ میں اور انجمن ترقی اردو کے ٹکٹ ۲ دینار اسٹریٹ جارج ٹون میں دس بجے سے چار بجے تک دستیاب ہونگی۔ ہم خرما و ہم ثواب۔ امید قوی ہے کہ مسلمانان مدراس کثیر تعداد میں گوکھلے ہال میں تشریف لائینگے اور مستفید ہونگے۔

پہلی جنوری سنہ ۱۹۲۹ء

خادم اسلام عبدالحمید حسن

اسلامی پریس ٹنگھری مدراس

علامہ سر محمد اقبال دام اقبالہٗ

کا

استقبال

بمقام سنٹرل اسٹیشن

یوم شنبہ ۷ بجے صبح ۵ جنوری سنہ ۱۹۲۹ء

انجمن ترقی اردو کا سپاسنامہ

اور

آپ کی تقریر "ہندوستان کی عالمگیر زبان" پر

بمقام گوکھلے ہال۔ ارمینن اسٹریٹ

یوم یکشنبہ (اتوار) دس بجے صبح ۶ جنوری سنہ ۱۹۲۹ء

اُسی روز اسی مقام پر گیارہ بجے

انجمن حمایت اسلام اور یتیم خانہ

دوسالہ کا جلسہ

زیر صدارت

علامہ سر محمد اقبال مدظلہ

آپکی تقریر "اسلام اور یتامیٰ" پر

خادم اسلام عبدالحمید حسن

نوٹ:- مدراس میں صرف یہی دو تقریریں اردو میں ہونگی

یکم جنوری سنہ ۱۹۲۹ء مدراس

اسلامی پریس ماتر ملکھری اپلی روڈ مدراس

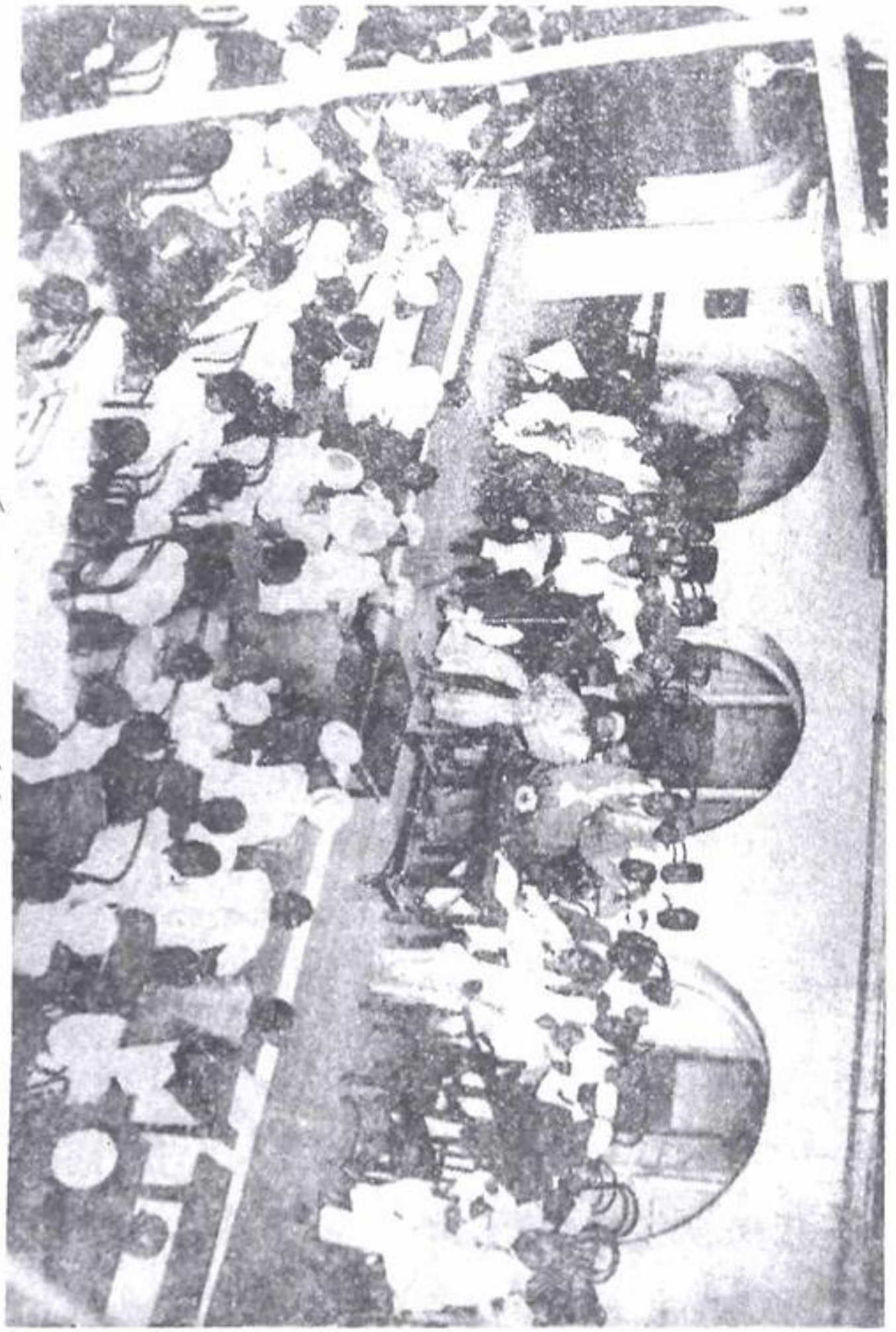

۶ر جنوری ۱۹۲۹ء۔ گوکھلے ہال مدراس۔ اقبال لکچر دیتے ہوئے۔

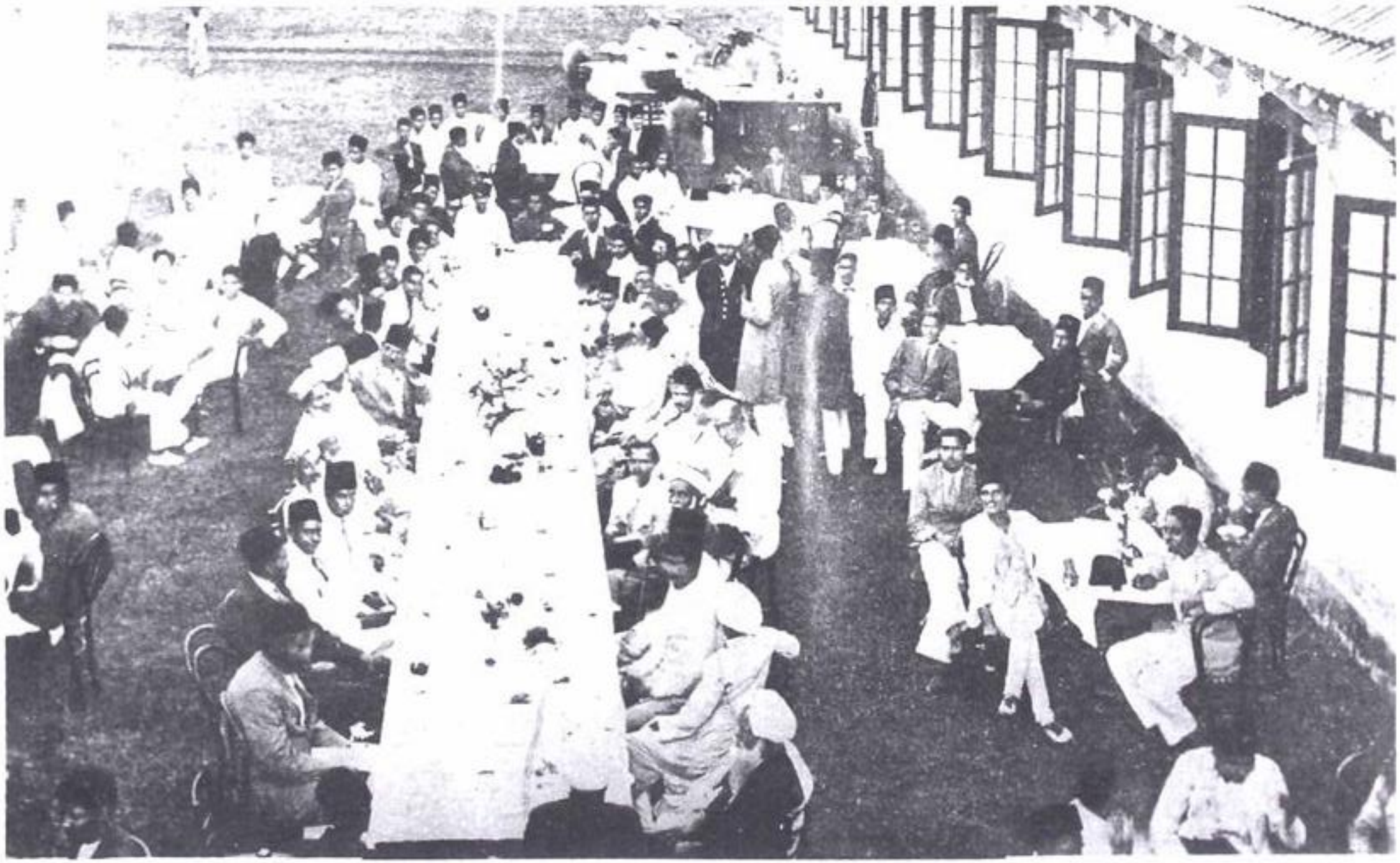

۶ رجنوری ۱۹۲۹ء۔ مدراس۔ اقبال کے اعزاز میں عصرانہ۔

ہندوستانی پرچار سبھا کے سپاس نامہ کی نیوز

(سفر مدراس کے موقع پر ۶ جنوری ۱۹۲۹ء کو انجمن ترقی اردو کے سپاس نامہ کے ساتھ ہندوستانی پرچار سبھا مدراس کی جانب سے ناگری رسم الخط میں بھی سپاس نامہ پیش کیا گیا تھا۔ اس کی نقل دستیاب نہ ہوسکی۔ البتہ اس بارے میں مشہور انگریزی روزنامہ "دی ہندو" میں جو نیوز شائع ہوئی تھی وہ یہاں پیش کی جارہی ہے۔ ادارہ)

Hindi Address

Sir Mohd. Iqbal received also Hindi address from the members of the Hindi Prachar Sabha written both in Arabic and Nagari scripts. The Hindi address while welcoming him to the South on behalf of the Hindi knowing public hoped to rejoice in the further progress of Hindustani in the South owing to the expected rigorous plea for the Hindustani being learnt by his co-religionists in the South. The address was presented to him enclosed in a beautiful frame.

Sir Mohd. Iqbal on rising to reply was greeted with lasting cheers.....

(The Hindu Jan 14, 1929)

ہندی سپاس نامہ

اراکین ہندی پرچار سبھا نے بھی ہندی سپاس نامہ مرتبہ بہ خط عربی و ناگری سر محمد اقبال کو پیش کیا۔ ہندی سپاسنامہ میں جہاں انہیں جنوب آنے پر خوش آمدید کہا گیا تھا۔ وہیں ہندی خواندہ عوام کی طرف سے اسی خوشی و تمنا کا بھی اظہار تھا کہ جنوب میں ان کے ہم مذہبوں کے ہندوستانی سیکھنے کے رجحان سے جنوب میں ہندوستانی زبان کی ترقی کی توقعات پوری ہونگی۔ سپاسنامہ جو ایک خوبصورت چوکھٹے میں تھا انہیں پیش کیا گیا۔ جب سر محمد اقبال جوابی تقریر کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تو فلک شگاف نعرہ ہائے تحسین بلند ہوئے۔

(دی ہندو - ۱۴ جنوری ۱۹۲۹ء)

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی

مولانا علی میاں بطور ترجمان اقبال

مولانا ابوالحسن علی ندوی برِعظیم کی ان نادرروزگار شخصیات میں سے تھے جو بیسویں صدی کی مِلّتِ اسلامیہ کے لیے بجا طور پر باعث فخر ہیں۔ ایمان وتقویٰ' درد وسوز' اخلاص وللّہیت' بے نفسی دبے لوثی اور مطالعہ وعلمیت' غرض گونا گوں اوصاف کے سبب ان کی شخصیت جامعیت کا ایک نمونہ تھی اور انفرادیت کی ایک مثال۔ اگر چہ ان کی کتابِ زندگی درس وتدریس، تلقین وتبلیغ، قلم وقرطاس' تقریر ومکالمہ اور سیر وسیاحت سے جیسے مختلف اور متنوع عنوانات میں بٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ لیکن اس کا اصل عنوان ایک ہی ہے' ایک ہی مقصد اور ایک ہی غرض وغایت...... اور وہ ہے بقول ملک نصر اللہ خاں عزیز!

میری زندگی کا مقصد تیرے دیں کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلماں میں اسی لیے نمازی (۱)

مولانا علی میاں عمر بھر سرفرازی دین کے لیے ہی متحرک ومستعد اور سرگرداں رہے' ع:
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را۔

مولانا کی قلمی کاوشوں پر نظر ڈالیں تو ایک حیرت انگیز تنوع کا احساس ہوتا ہے۔ انہوں نے قرآن' حدیث' سیرت' فقہ' تاریخ' سوانح' تعلیم' تہذیب اور عمرانیات کے مختلف موضوعات پر مضامین نو کے انبار لگا دیے' لیکن اس کی کثرت ووسعت کے باوجود' ان کی تصانیف اپنے مفاہیم ومعیار اور علمی وفکری اعتبار سے نہایت گراں قدر اور بلند پایہ ہیں۔ مولانا کی قلمی تگ وتاز کا ایک شعبہ علامہ اقبال کے فکر وفن کا مطالعہ بھی ہے۔ فکرِ اقبال کے بعض پہلوؤں سے متعلق بعض مختصر تاثرات وشذرات کے علاوہ انہوں نے عربی زبان میں ''روائعِ اقبال'' شایع کی' جس کا اردو ترجمہ (از مولوی شمس تبریز خاں) ''نقوش اقبال'' کے نام سے قبول عام حاصل کر چکا ہے۔ ''نقوش اقبال'' اقبالیات کی منتخب اور معیاری کتابوں میں سے ایک ہے اور اردو زبان وادب اور

اقبالیات کے بعض درسی نصابات میں بھی شامل ہے۔ مولانا علی میاں نے فکرِ اقبال کی روح کو جس خوبی و خوب صورتی سے اس کتاب میں پیش کیا ہے' اس کی داد اُردو کے چوٹی کے ادیبوں اور نقادوں نے دی ہے۔ جناب رشید احمد صدیقی کے خیال میں مولانا ابوالحسن ندوی ''پہلے عالم دین ہیں جس نے موجودہ صدی کی اردو شاعری کے سب سے بڑے نمائندے اور عظیم شاعر اقبال کی شاعری اور شخصیت کا مطالعہ غیر معمولی شوق اور بصیرت سے کیا ہے ..... سید صاحب کا ذہن' جدید ذہن کے تقاضوں سے آشنا ہے ..... (اور وہ) ان کے کلام میں ..... درک و بصیرت'' (رکھتے ہیں)۔ (۲) معروف شاعر اور ادیب ماہر القادری ادبی نقد و انتقاد میں کسی سے رو رعایت نہیں برتتے تھے۔ تبصرہ کتب کے ضمن میں ان کی شہرت ایک اکھل کھرے مبصّر کی تھی۔ انہوں نے ''نقوش اقبال'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

> ''فاضل مصنف نے جس نزاکت اور دیدہ دری کے ساتھ اقبال کے اشعار کی تشریح و ترجمانی کی ہے' اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ کتاب پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے شبلی کا قلم' غزالی کی فکر اور ابن تیمیہ کا جوش و اخلاص اس تصنیف میں کارفرما ہے۔ اقبال پر بڑی اچھی کتابیں آئی ہیں' مگر یہ کتاب اس مجاہد عالم کی لکھی ہوئی ہے' جو اقبال کے مردِ مومن کا مصداق ہے'' (۳)

ماہر القادری نے آخری جملے میں جو بات کہی ہے' وہ بڑی اہم اور معنی خیز ہے۔ ذخیرۂ اقبالیات میں بہت کچھ رطب و یابس ملتا ہے' کام کی چیزیں کم ہیں اور معیاری کتابیں تو بہت ہی کم ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیش تر اہل قلم نے کچھ لکھا' وہ محض ایک رسم و روایت نبھانے کے لیے لکھا ہے۔ اس کے برعکس مولانا علی میاں نے جو کچھ لکھا' وہ ایک خاص عقیدے کے ساتھ وابستگی اور اقبال کے ساتھ ایک ذہنی و فکری ہم آہنگی کی بنیاد پر لکھا' چناں چہ ''نقوش اقبال'' کا مطالعہ کرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کی فکر اور روح اس طرح گھل مل گئی ہیں' جیسے پھول میں خوشبو اور ستاروں میں روشنی۔ (ماہر القادری) (۴)

حقیقت تو یہ ہے کہ اقبال کے متن پر نقد و انتقاد کے گل بوٹے سجانا اور تجزیہ و تحلیل کے نام پر طول طویل مضمون باندھنا اور کتابوں کے انبار لگانا بلاشبہ ایک طرح کا کمالِ فن اور ہنر مندی کی بات ہے' مگر اقبال کی روح کو اپنے اندر جذب کرتے ہوئے ان کی شاعری کا صحیح فہم و تفقہ

حاصل کر کے' اقبال کی ترجمانی اور ان کے پیغام ''حیات ابدی'' کا ابلاغ بالکل ایک مختلف چیز ہے۔ اقبالیات کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت میں' راقم السطور کا احساس ہے کہ مولانا علی میاں' اُمتِ مسلمہ کے بارے میں علامہ اقبال کی تمناؤں اور آدرشوں کے نقیب تھے۔

''بال جبریل'' کی نظم ''ساقی نامہ'' میں علامہ کہتے ہیں:

مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں — مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز — مری خلوت و انجمن کا گداز
اُمنگیں مری ' آرزوئیں مری — اُمیدیں مری ' جستجوئیں مری
مری فطرت آئینۂ روزگار — غزالانِ افکار کا مرغزار
مرا دل مری رزم گاہِ حیات — گمانوں کے لشکر' یقیں کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر — اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹادے اسے — لٹادے ' ٹھکانے لگادے اسے

مولانا علی میاں' اسی ''متاعِ فقیر'' کے امین تھے۔ جن اصحاب نے بھی مولانا کی تحریروں کا کچھ نہ کچھ مطالعہ کیا ہے' انہیں اندازہ ہوگا کہ مولانا کے لفظوں' جملوں اور انداز و اسلوب میں علامہ ہی کے قلب اور ان ہی کی اُمنگوں' آرزوؤں' اُمیدوں اور ان ہی کے سوزِ جگر کا عکسِ جمیل نظر آتا ہے۔ مولانا کی درجنوں تصانیف' تقاریر' خطابات اور ان کی خودنوشت کاروانِ زندگی اقبال کے معنوی فیض سے معمور ہے۔

علامہ اقبال سے علی میاں کا ذہنی ربط دس برس کی عمر میں قائم ہوا اور کلامِ اقبال کے مسلسل مطالعے سے یہ ربط وضبط برابر نشو ونما پاتا رہا۔ اپنے عزیز دوست مسعود عالم ندوی (م: ۱۶/ مارچ ۱۹۵۵ء) کی رفاقت وصحبت سے مطالعہ اقبال کے اس ذوق کو مزید جلا ملی۔ مسعود عالم' مولانا علی میاں کے بہ قول علامہ اقبال کے ''بڑے پرجوش مبلغ'' تھے اور ''اقبال کے بارے میں ان کی حمایت حمیت تک پہنچی ہوئی تھی''۔ (۶) اسی زمانہ میں دونوں دوستوں نے اقبال کو عرب دنیا میں متعارف کرانے کا عزم کرلیا۔ علامہ کی وفات پر یہ عزم اور پختہ ہوگیا۔ علی میاں نے مسعود عالم صاحب کو پٹنہ خط لکھا کہ آپ ان کی حیات و پیغام پر لکھیں اور میں ان کے کلام کو عربی جامہ پہناؤں گا (۷) علی میاں کہتے ہیں کہ ہم نے اس مہم میں باہمی تعاون کا وعدہ کیا۔ مسعود عالم نے

بعض عربی جرائد میں علامہ پر متعدد مضامین لکھے' مگر ان کی زندگی نے وفا نہ کی۔ چناں چہ عربوں کو اقبال سے روشناس کرانے کا فرض علی میاں نے ادا کیا' اور خوب کیا۔ عالمِ عرب میں اقبال شناسی کے فروغ میں عبدالوہاب عزّام کے بعد غالباً علی میاں کا حصہ سب سے اہم ہے' بقول رشید احمد صدیقی: ''کیا مبارک یہ اتفاق ہے کہ عربی زبان میں عرب قوم کو اقبال کے پیغام سے آشنا کرنے کا امتیاز' سید صاحب کے حصے میں آیا'' (۸)

اقبال کی شاعری اور فکر سے اسی وابستگی کا نتیجہ ہے کہ موضوع کچھ بھی ہو اقبال کے اشعار' ان کے محسوسات و جذبات کا روپ دھار کر' علی میاں کی دلی ترجمانی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ مسلمانوں کے علوم کی بابت مستشرقین کے روّیوں کا ذکر ہو' قانونِ اسلامی کی تدوین جدید کی ضرورت پر بحث ہو' مغرب میں زیرِ تعلیم نوجوانوں کو ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلا رہے ہوں یا عالم اسلام کے لیے راہِ عمل کے تعیّن کا مسئلہ ہو' مولانا اپنے موقف کے اظہار کے لیے شعرِ اقبال کا سہارا لیتے ہیں۔ مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش پر قلم اٹھاتے ہیں تو اقبال ہی کے شعر کو بحث کا سرِ عنوان بناتے ہیں۔ ہسپانیہ جاتے ہیں اور اپنے وہاں سے دل پر چوٹ لے کر آتے ہیں تو بے اختیار ان کا ذہن علامہ کے اس مصرعے کی طرف منتقل ہوتا ہے:

آہ! کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں (۹)

آکسفورڈ یونی ورسٹی میں پیش کردہ مقالے کو وہ ''پس چہ باید کرد'' کی نظم: حرفے چند با امتِ عربیہ'' پر ختم کرتے ہیں کہ اس سے ان کے خیال میں ''نہ صرف کانوں بلکہ دلوں اور روحوں کا ذائقہ بھی تبدیل ہوگا'' (۱۰) مسلمانوں کے عروج و زوال پر بحث کے ضمن میں' وہ امت مسلمہ کو اُمید کی شعاع قرار دیتے ہیں تو اقبال کی نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' کے بعض اشعار ان کے احساسات کے ترجمان بنتے ہیں (۱۱) کبھی وہ عالم اسلام کے حالات پر اقبال کے الفاظ میں اس طرح شکوہ سنج ہوتے ہیں:

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گلِ ایراں' وہی تبریز ہے ساقی (۱۲)

۱۹۹۲ء میں بابری مسجد کے سفاکانہ انہدام اور بعد ازاں بمبئی' سورت اور مہاراشٹرا کے ہولناک فسادات میں ہونے والے مظالم پر تقریر کرنے کھڑے ہوتے ہیں تو اس کا آغاز بھی

''برصغیر کے قابل فخر اور مشہور ترین شاعر و ادیب اور فلسفی و مفکر علامہ اقبال'' کے ایک شعر سے کرتے ہیں:

تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ
عشق کاریست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند (۱۳)

اقبال کے بعض مصرعے اور ٹکڑے، علی میاں کی تقاریر و مضامین کے عنوان یا ضمنی عنوان بنتے ہیں، جیسے: ..... پا جا سراغ زندگی ..... محبت مجھے ان جوانوں سے ہے ..... خاص ہے ترکیب میں قوم رسولِ ہاشمی ..... حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری ..... مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے ..... خدا کی بستی دوکاں نہیں ہے، وغیرہ۔ دراصل ان کی جملہ تصانیف میں علامہ اقبال کے فکر اور ان کے پیغام ہی کی روح کارفرما ہے، ہمارے جید علمائے کرام میں سے غالباً کسی نے بھی علامہ اقبال سے اس قدر اعتنا نہیں کیا اور نہ ان کی شاعری سے اس قدر استشہاد کیا ہے، جتنا علی میاں نے۔

مولانا علی میاں، حرم نبویؐ میں واقع روضۂ جنت میں بیٹھے ہیں اور تاریخ کی قدیم یادیں، بادلوں کی طرح ان کے دل و دماغ پر چھا گئی ہیں۔ عالم تخیل میں انہیں محسوس ہوتا ہے کہ تاریخ اسلام کی بعض نامور شخصیتوں پر مشتمل وفود یکے بعد دیگرے بارگاہ نبویؐ میں حاضر ہو رہے ہیں۔ ان میں ائمہ کرام ہیں، محدثین ہیں، علماء و فقہاء ہیں، صلحائے امت کے ساتھ حکمراں اور بادشاہ بھی ہیں اور انقلابی مفکرین اور دانشوروں کے ساتھ شعراء بھی۔ ایک وفد میں جمال الدین افغانی، امیر سعید حلیم، محمد علی جوہر، حسن البناء اور محمد عاکف کے ساتھ علامہ اقبال بھی ہیں۔ بارگاہِ نبویؐ میں خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے، مولانا علی میاں نے جملہ اکابر کی ترجمانی کا اعزاز علامہ اقبال کو عطا کیا ہے۔ (۱۴) شاید اس لیے، بلکہ یقیناً اس لیے کہ اقبال، علی میاں کے الفاظ میں ''جدید مشرق کے سب سے زیادہ بالغ نظر مفکر'' تھے۔ (۱۵) ان کی ''سیاسی بالغ نظری'' (۱۶) ہی مملکتِ پاکستان کی بنیاد بنی۔ مولانا علی میاں نے اقبال کی شاعری کو سراہنے کے ساتھ ساتھ ان کی فکر سے استفادہ بھی کیا ہے۔ دورِ حاضر میں امتِ مسلمہ کو درپیش مسائل پر کلام کرتے ہوئے، وہ علامہ اقبال کے کارنامے کا جا بجا ذکر کرتے ہیں۔ اس ضمن میں علامہ نے اُمت کی جو رہنمائی کی اور جس بالغ نظری، اور حکمت و تدبر سے عمل کی راہیں روشن کیں، اس پر علی میاں، جدید مشرق کے اس سب سے زیادہ بالغ نظر مفکر کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مشرق کے اہل نظر اور ذہین افراد میں کوئی ایسا نہ تھا جس نے مغربی تہذیب وافکار کا اتنی گہری نظر سے مطالعہ کیا ہو اور اس قدر جرأت کے ساتھ اس پر تنقید بھی کی ہو'' (۱۷)

ان کا خیال ہے کہ اقبال کی سیاسی بالغ نظری اور بلند ہمتی کی مثال اس دور کے عالم اسلام میں مشکل ہی سے ملے گی۔ لیکن اقبال ک تمام تر مدّاحی اور ان سے اثر پذیری کے باوجود مولانا علی میاں کی اقبال شناسی افراط وتفریط سے پاک ہے۔ اقبال اور فکر اقبال کے بارے میں ان کی مجموعی رائے متوازن اور بہت صائب ہے۔ لکھتے ہیں:

''میں اقبال کو کوئی معصوم ومقدس ہستی اور کوئی دینی پیشوا اور امام مجتہد نہیں سمجھتا' اور نہ میں ان کے کلام کے استناد اور مدح سرائی میں حدِ افراط کو پہنچا ہوا ہوں۔

(کیوں کہ) اقبال کے یہاں اسلامی عقیدہ وفلسفہ کی ایسی تعبیریں بھی ملتی ہیں' جن سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ (اس کے باوجود) سچ تو یہ ہے کہ میں اپنی زندگی کے ہر دور میں اس کا قائل رہا کہ وہ اسلامیات کے ایک مخلص طالب علم رہے' اور اپنے مقتدر معاصرین سے برابر استفادہ ہی کرتے رہے'' (۱۸)

علامہ اقبال کی شخصیت وران کی فکر سے مولانا ابوالحسن علی ندوی کے ربط وارتباط کے بہت سے پہلو ہیں: اقبال سے ان کا شخصی تعلق ..... ان کی شخصیت پر فکر اقبال کے اثرات یا فکر اقبال سے ان کا تاثر ..... ان کے تحریری سرمائے میں فکر اقبال کی ترجمانی اور ..... اقبال کے فکری نصب العین کی تعمیل وتکمیل کے لیے ان کی علمی وعملی کاوشیں وغیرہ ..... ان سارے پہلوؤں کی تفصیل مولانا کے ذخیرۂ تصانیف میں بکھری ہوئی ہے ..... دراصل یہ موضوع ایک سیر حاصل تجزیے' بلکہ پورے ایک کتابی جائزے کا متقاضی ہے۔ زیر نظر سطور میں فقط چند نکات کی طرف اشارہ کیا جاسکا ہے۔

اقبال کی وفات پر علی میاں نے اپنے قریبی دوست اور ہم درس مولانا مسعود عالم کو ایک خط لکھا تھا' جس میں کلام اقبال کے عربی ترجمے اور تعاون کے دیرینہ عزم کی تجدید کا ذکر تھا۔ یہ مکتوب' اقبال کی وفات پر ان کے جذبات کا عکس ہے اور اس موضوع سے ان کے تعلق کا ایک اہم نقش بھی۔ اقبالیات پر مرحوم کے ایک تبرک کی حیثیت سے' اسے ذیل میں پیش کیا جارہا ہے: (۱۹)

۲۶/اپریل ۱۹۳۸ء
ندوۃ العلماء، لکھنو

محبِ گرامی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حیراں ہو کہ کن الفاظ میں آپ سے تعزیت کروں کہ خود قابل تعزیت ہوں، میں اپنے دل کے آئینے میں آپ کے دل کی کیفیت دیکھ رہا ہوں۔ خبر سنتے ہی بے اختیار جی چاہا کہ آپ کے پاس چلا جاتا۔ زبان پر یہ شعر جاری تھے:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
جہاں بانی سے مشکل تر ہے دنیا میں جہاں بینی
جگر جب خون ہوتا ہے تو ہوتی ہے نظر پیدا (۲۰)

حالات تمام آپ کو لاہور کے اخبارات سے معلوم ہوئے ہوں گے۔ آخری شعر یہی پڑھے ہوں گے۔ افسوس ہے کہ آخر میں قوم و وطن کا ناگوار قضیہ پیش آ گیا، جس سے ان کو تکلیف ہوئی ہوگی۔ اس سے تسکین ہوتی ہے کہ انہوں نے سید صاحب کا مضمون پڑھ لیا ہوگا۔ مسعود صاحب! کلام کا عربی ترجمہ فرض ہے اور اب رہ رہ کر یہی خیال آتا ہے کہ یہ کام ہو جانا چاہیئے اس کام کا اہل ہندوستان میں دو آدمیوں کو سمجھتا ہوں۔ دوسرے سے کہنے کی بات نہیں، آپ سے کہتا ہوں۔ آپ کو اور آپ کے بعد (خاکساری برطرف) اپنے کو، لیکن میں کر نہیں سکتا اور آپ خدا کا شکر ہے، موجود ہیں۔ یہ کام شروع کر دیجیے۔ میرا خیال ہے کہ انتخاب کیا جائے۔ انتخاب میں میں بھی مدد کر سکتا ہوں۔ میرے نزدیک بانگِ درا کا حصہ ''خضراہ'' مع ''طلوعِ اسلام''، ''بالِ جبریل''، ضربِ کلیم کا بیش تر حصہ اور فارسی کلام کا سیاسی اور خالص اسلامیہ حصہ..... کہیے کہ آپ اس کام کو کب شروع کریں گے؟.....

..... (خط کا باقی حصہ موضوع سے غیر متعلق ہے)

(والسلام، علی)

اس خط میں جس فرض کا ذکر ہے، مولانا علی میاں اپنی پوری زندگی میں اسے ادا کرنے کی

سعی کرتے رہے۔ انہوں نے زندگی بھر اسی ایمان و یقین، عزم و حوصلے، خودشناسی اور خداشناسی، درد و سوز اور جرأت و فراست کا درس دیا، جس کی تلقین ہمیں کلامِ اقبال میں ملتی ہے۔ ان کی اپنی زندگی ایک نئے جہاں کی آرزومندی سے عبارت تھی اور وہ ہمیشہ ''کھوئے ہوؤں کی تلاش'' میں لگے رہے اور اسی لیے انہیں ''ترجمانِ اقبال'' کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا۔

حوالے اور حواشی

۱۔ کاروانِ شوق، مکتبہ اردو ڈائجسٹ، لاہور ۱۹۶۹ء

۲۔ نقوشِ اقبال۔ از ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام، کراچی ۱۹۷۶ء ص ۱۳، ۱۴، ۲۴

۳۔ حوالہ ۲ ص ۱۲

۴۔ ایضاً۔

۵۔ بالِ جبریل، شیخ غلام علی اینڈ سنس، لاہور ۱۹۷۲ء ص ۱۲۵

۶۔ حوالۂ ۲ ص ۳۴

۷۔ حوالہ ۲، ص ۳۶

۸۔ حوالہ ۲، ص ۱۵، ۱۶

۹۔ تحفۂ کشمیر، مجلس نشریات اسلام، کراچی، س ن، ص ۸۴۔

۱۰۔ انسانیت کا محسنِ اعظمؐ، مجلس نشریات اسلام، کراچی، [۱۹۸۹]۔ ص ۳۰۔

۱۱۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، مجلس نشریات اسلام، کراچی، س ن۔ ص ۳۵۴

۱۲۔ حدیثِ پاکستان، مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۱۹۷۵ء ص ۱۱۵۔

۱۳۔ کاروانِ زندگی، پنجم، مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۱۹۹۳ء ص۔ ۱۱۷

۱۴۔ کاروانِ مدینہ مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۱۹۷۵ء۔ ص ۱۰۴

۱۵۔ مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۱۹۷۴ء ص۔ ۱۱۰

۱۶۔ حوالہ ۱۵، ص ۱۲۰

۱۷۔ حوالہ ۱۵، ص ۱۱۰، ۱۱۱

۱۸۔ حوالہ ۲ ص ۳۹۔

۱۹۔ یہ غیر مطبوعہ خط راقم کو اپنے عزیز دوست پروفیسر سلیم منصور خالد کے توسط سے مسعود عالم ندوی کے شاگرد عزیز عاصم الحداد (م: ۱۱/اپریل ۱۹۸۹ء) کے کاغذات سے دستیاب ہوا تھا۔ پہلی بار میں نے اسے اپنے ایک مضمون ''عالم عرب میں اقبال شناسی'' (مشمولہ: اقبالیاتی جائزے، گلوب پبلیشرز، لاہور، ۱۹۹۰ء) میں شائع کیا تھا۔

۲۰۔ مولانا نے یہ شعر محض یادداشت کے بھروسے پر لکھا تھا بانگ درا (ص۔ ۲۶۸) میں یہ شعر اس طرح ہے:

جہاں بانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا

۲۱۔ حوالہ ۱۱، ص ۴۰۳، ۴۰۴۔

ooo

o

''زبانیں اپنی اپنی اندرونی قوتوں سے نشوونما پاتی ہیں اور نئے نئے خیالات و جذبات کو ادا کر سکنے پر ان کی بقاء کا انحصار ہے''

(مکتوب اقبال مورخہ ۹ ستمبر ۱۹۳۷ء بہ نام بابائے اردو مولوی عبدالحق،
اقبال نامہ۔ حصہ دوم، ص ۸۵)

کے۔پی۔شمس الدین
ترورکاڈ، ملاپورم (کیرلا)

کیرالا میں مطالعۂ اقبال اور عبدالصمد صمدانی

جنوبی ہندستان کی ریاست کیرالا کے علمی، ثقافتی، تہذیبی حالات کے متعلق بہت کم لوگ واقف ہیں، سیاسی ادبی اعتبار سے بھی اس ریاست کو وہ شہرت نہیں ملی جو ملنی چاہئے تھی۔

لیکن اب انفارمیشن ٹکنالوجی کا دور ہے، گلوبل ویلیج کا زمانہ ہے۔ کیرالا کے متعلق ہر خاص و عام اس تاریخی خطہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں۔ جنگِ آزادی کی پہلی لڑائی پرتگیزیوں کے خلاف اسی کے ساحل میں ہوئی۔ تاریخی روایات کے مطابق اسی کے ساحل میں نبی اکرم ﷺ کے دور حیات میں ہی اسلام کا تعارف ہوا۔ کہا جاتا ہے کے اسی ریاست کے ساحل پر یہاں کے راجہ چیرامان پرومال نے شق القمر کا نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر دین اسلام قبول کیا تھا۔

کیرالا اپنی تہذیب وتمدن اور زبان کی وجہ سے الگ تھلگ ہونے کی وجہ سے مشترکہ طور پر دوسرے صوبوں سے میل ملاپ میں زیادہ ربطہ قائم نہیں رہا۔ آج شمالی ہندوستان میں جو کچھ ہونا چاہئے تھا وہ کیرالا میں ہو رہا ہے۔ اُردو زبان کی ترقی، اقبالیات جیسے موضوع پر کیرالا میں سرگرمیاں فروغ پا رہی ہیں۔ علامہ اقبال پر دُنیا کے کونے کونے میں مطالعہ اور تحقیق کا کام جاری ہے۔ اُردو کے شاعروں میں اقبال پر سب سے زیادہ کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ہندوستان میں شاید ہی ایسی کوئی ریاست ہو جہاں اقبال پر کچھ نہ کچھ کام نہ ہو رہا ہو، جنوبی ہند میں ہی نہیں۔ شاید سارے ہندوستان میں سب سے زیادہ اقبال کے موضوع پر کتابیں رسالے، تحقیقی مقالے حیدرآباد کے اقبال اکیڈیمی میں موجود ہیں۔ لیکن اقبال کے نام پر عالیشان عمارت کا وجود (برائے نام نہیں بطور کام) شاید کیرالا میں ہی ہے۔

کیرالا میں اقبال پر ملیالم زبان میں بہت کام ہوا ہے، لیکن شروعات اقبال کی زندگی میں

ہی ہوئیں، رسالوں میں اقبال پر مضامین شائع ہوتے رہے اور کوچین میں ۱۹۳۶ء میں ''اقبال لائبریری اینڈ ریڈنگ روم'' جناب ابراہیم حاجی قاسم سیٹھ کوچین والا نے قائم کی اور وہ اس کے پہلے صدر بھی تھے۔ یہ لائبریری صرف اقبال کے نام پر ہی ہے لیکن یہاں اقبال پر کتابیں کم ہی ہیں' اس کے علاوہ چند کتب خانے اور دار المطالعے اقبال کے نام سے قائم ہوئے۔ عملاً اقبال کی تعلیمات کو عام کرنے سے ان کا تعلق نہیں رہا۔

ملیالم زبان میں اقبال پر سب سے پہلی کتاب ''اقبال'' کے نام سے ۱۹۴۶ء میں تریوندرم سے شائع ہوئی۔ دوسو صفحات پر مشتمل اِس کتاب کے مصنف وِکم عبدالقادر Vikkam Abdul Qadir تھے۔ بعد میں انھوں نے اسرارِ خودی کا ترجمہ بھی شائع کیا۔ اس کے بعد ٹی۔ عبید' او۔ ابو، سی۔ سی۔ ایم۔ صالح، موسیٰ ناصح محمد تلمورو غیرہ اور مادھون جیسے غیر مسلم اصحاب نے بھی مختصر کتابیں لکھ کر شائع کیں۔ کچھ آزادی سے پہلے اور کچھ آزادی کے بعد شائع ہوئیں۔

ملیالم روزناموں میں اقبال پر اکثر مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں ان مضمون نگاروں میں کے کے۔ محمد عبدالکریم، ایس ایم سرورؔ، کے پی کنجی موسیٰ، کے ایم احمد، ابراہیم بے ونجا، احمد کُٹی کلاتل جیسے شخصیتوں کے نام شامل ہیں۔

کیرالا کے واحد اُردو ادیب وشاعر مرحوم ایس۔ ایم۔ سرورؔ اقبال سے متاثر تھے۔ سرورؔ صاحب کے ابتدائی کلام میں اقبال کا رنگ ڈھنگ اور طرز جھلکتا ہے۔ سید محمد سرورؔ کے دو مجموعہ کلام شائع ہو چکے ہیں ''ارمغان کیرالا'' اور ''نوائے سرورؔ''۔ اس میں اقبال پر بھی نظمیں لکھیں گئی ہیں۔ اقبال کے فرزند جاوید اقبال نے شعری مجموعہ ''ارمغان کیرالا'' ملنے پر اس کی ستائش کرتے ہوئے سرورؔ صاحب کو پیغام بھی ارسال کیا تھا۔ سرورؔ صاحب اقبال کے فارسی کی چند نظموں کا بھی اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ بطور نمونہ چند اشعار پیشِ خدمت ہیں۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم — بنائی ہے شب تو نے، میں نے چراغ
سفال آفریدی ایاغ آفریدم — بنائے خزف تو نے، میں نے ایاغ
بیاباں و کہسار و راغ آفریدی — کئے تو نے پیدا، بیاباں وکہسار
خیاباں و گلزار و باغ آفریدم — کئے میں نے پیدا، خیاباں وگلزار

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم　　میں کرتا ہوں سنگ سے آئینہ پیدا
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم　　میں کرتا ہوں زہر سے نوشینہ پیدا

(۱۱/نومبر ۱۹۶۶ء)

علامہ اقبال کی بانگ درا کا ترجمہ کچھ عرصہ قبل ملیالم میں ہوا ہے لیکن یہ ترجمہ اصل مفہوم سے قریب نہیں ہے موپلا شاعر پی۔ ٹی۔ عبدالرحمٰن نے موپلا گیت کے طرز پر ترجمہ کیا ہے۔ پی۔ ٹی۔ عبدالرحمٰن کی اردو سے ناواقفیت کی وجہ سے ترجمانی کا حق ادا نہ ہوسکا۔ مرحوم نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ راست اردو کلام سے استفادہ کرتے ہوئے پی۔ ٹی۔ عبدالرحمٰن اور پی۔ اے۔ کریم نے اشعار کا جو مفہوم ملیالم میں پیش کیا ہے وہ موپلا طرز کے گیت کے طرز پر ہے۔ پھر بھی بانگ درا کا ملیالم میں ترجمہ قابل قدر بات ہے۔ اسی طرح اُردو کے گلوکار عبدالرحمٰن آواز اوران کے چند احباب نے مل کر اقبال کی چند نظموں کے ترنم و آہنگ کے ساتھ کیسٹ جاری کئے' اس کیسٹ میں دوسرے گلوکار بھی ہیں' البتہ ملیالم کا کچھ اثر ان نغموں میں ہے۔

بعض لوگوں نے اپنی شہرت کے لئے بھی اقبال کو نامناسب انداز میں پیش کیا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں اقبال پر ایک دو کتابیں شائع ہوئیں ہیں۔ جو اقبال کو بدنام کرنے کے برابر ہیں کسی نے اقبال کو عاشق مزاج شخص کے روپ میں پیش کیا ہے۔ کسی نے دوسرے انداز میں لیکن ایسی کتابیں نہ ہونے کے برابر ہیں اور نہ بازار میں دستیاب ہیں کیونکہ عام لوگوں نے بھی ایسی کتابوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ویسے اُردو اور فارسی سے واقفیت کے بغیر اقبال پر یا ان کے اشعار پر کچھ لکھنا ہی غلط ہے۔ یہ کمی ایسے مفاد پرست لوگوں کی بڑی کوتاہی ہے۔

آزادی سے قبل کیرالا تین صوبوں پر مشتمل تھی ملیبار، کوچین اور ٹراونکور جس میں ملیبار پر مسلم لیگ کی مضبوط گرفت تھی۔ مسلم لیگ کے ہر چھوٹے بڑے آفس میں علامہ اقبال کی تصویر پہلے دکھائی دیتی تھی۔ جلسے منعقد کئے جانے والے مقامات کو ''علامہ اقبال نگر'' کا نام دیا جاتا تھا۔ ۱۹۳۴ء سے شائع ہونے والا ''چندریکا'' اخبار مسلم لیگ کا ترجمان ہے (آج بھی باقاعدہ طور پر شائع ہورہا ہے۔ اور سب سے زیادہ اقبال پر مضامین شائع کرنے والا اخبار ہے) جس میں ہمیشہ اقبال پر مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ تقسیم ہند اور آزادی کے بعد سب کچھ بدل گیا یہاں کے مسلم لیگ کے رہنما اور محمد علی جناح کے دستِ راست جناب حاجی عبدالستار حاجی اسحٰق سیٹھ

صاحب کے پاکستان چلے جانے سے یہاں کے سیاسی حالات میں بہت تبدیلی ہوئی۔ آزادی کے بعد محمد اسمٰعیل صاحب نے انڈین یونین مسلم لیگ قائم کی تو کیرالا کے مسلمانوں کی ایک نئی سیاسی پارٹی کا اثر اتنا زیادہ نہیں تھا جتنا پہلے تھا۔

اُردو کا نام لینا یا اقبال پر کچھ لکھنا تنگ نظری سمجھا جاتا تھا۔ اسی دور میں انڈین یونین مسلم لیگ کے قیام کے بعد IUML کے ترجمان ''چندریکا'' نے اقبال پر خصوصی شمارہ جاری کیا۔ آپسی سے میمن حضرات نے اقبال پر سوونیر شائع کئے۔ IUML کے دفتروں میں بھی اقبال کی تصاویر نظر آنے لگیں۔ کیرالا اُردو ٹیچرس اسوسی ایشن کا سہ ماہی جریدہ ''اُردو بلٹن'' نے بھی اقبال نمبر شائع کیا اس طرح اقبال ادبی، اور ثقافتی حلقوں میں بھی اقبال کا چرچا ہونے لگا۔

اسی دوران روزنامہ ''چندریکا'' میں مسلسل اقبال پر مضامین شائع ہو رہے تھے جو سب کی توجہ کا مرکز بن رہے تھے۔ لوگ یہ جاننا چاہتے تھے کہ مسلسل اقبال پر لکھنے والے کون ہیں۔ جو اقبال پر تحقیقی نظر رکھتے ہیں۔ یہ تھے خوبرو نوجوان جناب ایم۔ پی۔ عبدالصمد صمدانی جو ایک اچھے مقرر بھی ہیں۔ اقبال کے اشعار کے بغیر ان کی تقریریں ادھوری رہتیں۔ آج کیرالا کا بچہ بچہ صمدانی کو جانتا ہے۔ اور جو صمدانی کو جانتا ہے وہ اقبال کو جاننے لگا۔ اقبال کے پیام، ان کے فن وغیرہ کا جس انداز اور ڈھنگ سے کیرالا میں صمدانی نے تعارف کرایا ہے شاید ہی کوئی اور ہو۔

عبدالصمد صمدانی کی پیدائش ضلع ملاپورم میں ایک بزرگ عالم دین مولانا عبدالحمید حیدری کے گھر ہوئی۔ مولانا عربی، اُردو، فارسی اور ہندی کے ماہر تھے عبدالصمد صمدانی کے لئے مولانا عبدالحمید ان کے والد محترم ہی نہیں بلکہ اُستاد بھی تھے۔ ابتدائی تعلیم کے علاوہ عربی، اردو، فارسی کی تعلیم بھی گھر پر ہی ہوئی۔ سنسکرت کی تعلیم کے لئے والد نے ایک استاد (کنجونمبیار) کو مقرر کیا تھا۔ بچپن ہی سے گھر میں امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور علامہ اقبال کا چرچا ہوتا تھا۔ اقبالیات کا ماحول تھا۔ صمدانی صاحب کے والد محترم بڑے خوشخط انداز میں علامہ اقبال کے اشعار اور اس کی شرح لکھا کرتے تھے۔ یہی نہیں، مولانا عبدالحمید صاحب نے قرآن شریف کا اردو میں ترجمہ بھی کیا یہ کیرالا کی واحد شخصیت تھے جنہوں نے قرآن شریف کے اُردو ترجمہ کے لئے پہل کی ہے۔ لیکن اس نیک کام کی تکمیل سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کا بلاوا آ گیا۔ اور وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

جناب عبدالصمد صمدانی اسکول کی تعلیم کے بعد جب کالج پہنچے تو بطور سکنڈ لینگویج اُردو کا انتخاب کیا اس کی خاص وجہ یہی تھی کہ اردو کے ذریعے اقبال کو اور زیادہ جاننے کا موقع ملے۔ فاروق کالج میں ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی صاحب (جو اس وقت میسور کے سر قاضی ہیں) کے شاگرد بنے تو اقبال کی شاعری اور فلسفہ سے زیادہ لگاؤ ہوا۔ تاریخ میں ایم۔اے کی سند حاصل کرنے کے بعد ایم۔فل میں ''علامہ اقبال اور امینیول کانٹ (Immanuel Kant) کا تقابلی مطالعہ'' کے موضوع پر مقالہ پیش کر کے ڈگری حاصل کی۔ فی الحال دہلی کے جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں ڈاکٹر آر۔ پی۔ سنگھ کی زیر نگرانی میں ''اقبال اور فلسفہ'' پر پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ اسی دوران ایل۔ایل۔بی کی ڈگری حاصل کر کے تلشیری کی دوسو سال پرانی عدالت میں ۱۸ر اپریل ۲۰۰۴ء کو انرولمنٹ بھی کیا۔ اس کے دوسرے دن تمام اخباروں میں ''صمدانی راہِ اقبال پر'' کی سُرخی کے ساتھ خبریں شائع ہوئی تھیں۔

ان ساری سرگرمیوں کے علاوہ جناب عبدالصمد صمدانی ایک اچھے سیاست داں اور مقرر کی حیثیت سے ساری ریاست میں مقبول ہیں۔ جناب عبدالصمد صمدانی مسلم لیگ کے اعلیٰ درجہ کے رہنماؤں میں سے ہیں۔ ۱۹۹۲ء میں صمدانی صاحب کو راجیہ سبھا کے لئے چن لیا گیا انہوں نے پارلیمنٹ میں اردو میں حلف لیا۔ جس پر دوسرے ممبران پارلیمنٹ حیرت کا اظہار کر رہے تھے کہ ملیالی ایم۔پی اور اُردو! یہی نہیں حلف برداری کے بعد انہوں نے اقبال کی نظم ''فنونِ لطیفہ'' پڑھی

اے اہل نظر' ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شئے کی حقیقت کو نہ دیکھے' وہ نظر کیا

سارا ایوان اقبال کے اشعار سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس وقت کی ڈپٹی اسپیکر محترمہ نجمہ ہبت اللہ نے اس نظم کو دوبارہ مکمل طور پر سنانے کی فرمائش بھی کی۔

ایم۔پی بننے کے بعد صمدانی کو دنیا کے مختلف ممالک کا دورہ کرنے کا موقع ملا۔ دل میں اقبال کو لیے گھومتے گھومتے کیرالا میں علامہ اقبال کی ایک خوبصورت یادگار ALLAMA IQBAL INDIAN HUMANITARIAN FOUNDATION قائم کرنے کی ٹھان لی۔ یہ کام اتنا آسان نہیں تھا جتنا سوچا گیا تھا۔ اللہ کے بھروسے پر عبدالصمد صمدانی نے قدم آگے بڑھایا اللہ تعالیٰ نے اپنی نصرت سے ان کے خواب کو حقیقت میں بدل دیا۔

اقبال فاؤنڈیشن کا سنگ بنیاد، ریاست کیرالا کے مسلم لیگ کے صدر سید محمد علی شہاب تھنگل نے رکھا۔ اس کے بعد اقبال پر کئی پروگرام اور سیمنار وغیرہ منعقد کیے گئے۔ ایسے ہی ایک سیمنار میں مشہور صحافی اور ممبر پارلیمنٹ جناب کلدیپ نیّر میں تشریف لائے اور اپنی مسحور کن تقریر سے اقبال کے تاریخی حقائق پر روشنی ڈالی۔

۲۰/اپریل ۲۰۰۳ء بروز اتوار کو علامہ اقبال کی یادگار عالیشان عمارت ALLAMA ITARIAN FOUNDATIONIQBAL INDIAN HUMAN کا افتتاح عمل میں آیا۔ اس تقریب میں افتتاحی خطبہ سید محمد علی شہاب تھنگل اور کلیدی خطبہ کلدیپ نیر ایم۔ پی۔ نے پیش کیا۔ تقریری مقابلے میں حصہ لینے والے طلبہ میں مہمان خصوصی مولانا انظر شاہ کشمیری نے انعامات تقسیم فرمائے اور دیگر وزراء، ممبران پارلیمنٹ، ضلع کلکٹر، کالی کٹ یونیورسٹی کے وائس چانسلر جیسی عظیم ہستیوں نے اس تقریب میں شرکت کی، شکریہ ملیالم کے مشہور شاعر پی۔ کے۔ گوپی نے ادا کیا۔

اس عالیشان عمارت کے رنگ ڈھنگ کا اپنا الگ ہی انداز ہے۔ فاؤنڈیشن کو دیکھتے ہی اقبال سے ناواقف لوگ بھی اقبال کو جاننے کی ضرور کوشش کریں گے۔ یہاں ہمیشہ کسی نہ کسی پروگرام کا انعقاد عمل میں آتا ہے۔ اندرون و بیرون کیرالا سے نامور ہستیاں یہاں شریک ہوتی ہیں اہل علم بے حد مفید مقالے بھی پیش کرتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں ۲۸/جنوری ۲۰۰۴ء، بروز بدھ پروفیسر گوپی چند نارنگ یہاں تشریف لائے تھے اور علامہ اقبال پر ایک بہترین تقریر کی۔ نارنگ صاحب نے اقبال کے شاعری کے مختلف پہلوؤں کو پر اثر انداز میں پیش کیا۔ اس جلسہ کا صدارتی خطبہ خود عبدالصمد صمدانی نے دیا۔ اور خطبہ استقبالیہ جناب ایس۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی کے اُردو ریسرچ آفیسر این۔ محی الدین کٹی نے پیش فرمایا۔ اس تقریب میں کیرالا اُردو ٹیچرس اسوسی ایشن کے جنرل سیکریٹری جناب احمد کٹی کلاتل، انجمن ترقی اردو (کیرالا) کے جنرل سیکریٹری حمید کاراشیری اور ملیالم کے شاعر پی۔ کے۔ گوپی نے حصہ لیا۔

۱۷/فروری ۲۰۰۴ء بروز منگل کالی کٹ میں منعقدہ کیرالا اردو ٹیچرس اسوسی ایشن کے سالانہ جلسہ میں آئے ہوئے۔ مہمان خصوصی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر جناب حمید اللہ بھٹ صاحب نے اقبال فاؤنڈیشن کا معائنہ کیا اور تعجب کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔ ''کیرالا میں اقبال واہ بھئی واہ .....'' اسی جلسہ میں بمبئی سے آئے ہوئے روزنامہ

''اردو ٹائمز'' کے فیچر ایڈیٹر جناب سعید حمید صاحب بھی اس فاؤنڈیشن کی اس عمارت کو دیکھ کر کہا ''علامہ اقبال کی ایسی یادگار بمبئی میں کہاں؟''

کیرالا کے ضلع کالی کٹ کی اہم شاہراہ پر یادگارِ اقبال کے طور پر اس غیر اردو داں ریاست میں عشقِ اقبال میں عبدالصمد صمدانی نے جو عمارت بنائی ہے اس کی تعمیر میں کسی اردو اکیڈیمی یا اردو کونسل یا ریاستی اور مرکزی حکومت یا، کسی ایم۔ایل۔اے یا ایم۔پی کے فنڈ کا ایک روپیہ بھی شامل نہیں ہے۔ حالانکہ خود ایم۔پی کو کثیر فنڈ ملتا ہے لیکن سرکار کا ایک روپیہ بھی استعمال نہیں کیا گیا۔صمدانی صاحب نے نہ صرف اپنا سرمایہ لگایا اور اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کے تعاون سے یہ شاندار عمارت تعمیر کی اور کثیر سرمایہ سے کتابیں (صرف اقبال پر) یہاں جمع کیں اقبال فاؤنڈیشن میں مندرجہ ذیل علمی، اور ادبی، ادارے کام کر رہے ہیں اور یہ ادارہ ایک علمی اور ادبی مرکز بن گیا ہے۔

۱۔علامہ اقبال انڈین ہیومینیٹیرین فاؤنڈیشن
۲۔ڈاکٹر سر محمد اقبال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف فلاسفی
۳۔اقبال اکیڈیمی
۴۔علامہ اقبال آڈیٹوریم
۵۔ڈاکٹر اقبال سنٹر فار انڈین اینڈ فلانتروفک اسٹڈیز
۹۔بیرسٹر اقبال لیگل سنٹر

ان سب کاموں کے لئے اکیڈیمی میں خود کا ایک پرنٹنگ پریس بھی ہے۔

عبدالصمد صمدانی نے اقبالیات پر ابتک ملیالم میں پندرہ کتابیں شائع کی ہیں۔صمدانی کے اقبال پر اب تک کے مقالات جو انہوں نے مختلف رسائل، اخبارات اور سووینیرس میں لکھے ہیں ان سب کو یکجا کیا جائے تو تین جلدوں میں شائع کیا جا سکتا ہے۔

مولانا ابوالحسن ندوی صاحب کی ''نقوش اقبال'' کا ترجمہ بھی شائع کیا گیا۔ ندوی صاحب سے قریبی تعلقات تھے اس کا ذکر انہوں نے اپنی کتاب ''کاروان زندگی'' میں کیا ہے۔

کیرالا میں کثیر تعداد میں لوگوں کو اکٹھا کرنے کا سہرا بھی صمدانی کے سر جاتا ہے۔ ماہِ رمضان المبارک میں تین شبینہ دینی تقاریر ہوتی ہیں۔ یہ دینی جلسہ کالی کٹ کے ساحل پر منعقد کیا

جاتا ہے۔ جس میں شرکت کرنے والوں کی تعداد ڈیڑھ لاکھ سے زائد ہوتی ہے۔ تقریباً چار گھنٹے مسلسل تقریر کرتے ہیں۔ خطبہ میں اقبال کے اشعار کی پھلجھڑیاں بکھرتی ہیں' سمندر کی لہروں سے ٹکراتے ہوئے اقبال کے اشعار سننے والوں کو مسحور کر دیتے ہیں۔ اجتماع کی جگہ کو ''علامہ اقبال نگر'' کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ علامہ اقبال کو سچے دل سے چاہنے والی ایسی شخصیت شائد ہی کہیں اور ملے۔ اقبال کا قرآن مجید سے لگاؤ اور رسول اکرم ﷺ سے گہری محبت، یہ باتیں جناب عبدالصمد صمدانی کی تقریر کا خاص وصف ہیں۔ وہ اپنی تقاریر سے ان باتون کو عوام تک پہنچا رہے ہیں۔

اقبال پر عبدالصمد کے نمایاں کاموں اور عالیشان اقبال فائنڈیشن سے متاثر ہوکر ناچیز کے دل سے یہ چند اشعار لب پر آئے:

عمارتِ اقبال سے تونے پھیلائی ہے وہ روشنی
کبھی نہ بھولیں گے اردو داں تجھے اے صمدانی
تیری کاوشوں کا ذکر ہے محفلوں میں سب کی زبانی
تا قیامت دنیا ادا کرے گی شکریہ تیرا اے صمدانی

☆☆☆☆☆

میری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرم رازِ درونِ مئے خانہ

اقبال اکیڈیمی کا سمینار

منعقدہ: ۱۷ر جولائی ۲۰۰۴ء

موضوع: اقبال کے لسانی تصورات اور زبان

مقالہ نگار: ۱۔ پروفیسر عبدالستار دلوی

سابق صدر شعبۂ اُردو بمبئی یونیورسٹی

۲۔ ڈاکٹر محمد ضیاء الدین احمد شکیب

سابق استاد شعبہ انڈولوجی لندن یونیورسٹی

صدارت: پروفیسر مغنی تبسم

سابق صدر شعبۂ اُردو جامعہ عثمانیہ

اُردو زبان اور فلسفۂ زبان پر اقبال غیر معمولی بصیرت کے حامل تھے، ان کے نزدیک زبان احساس زندگی کی معنویت کا اظہار ہے۔ اقبال نے اپنی شعری زبان کو اس بلند مقام تک پہنچادیا کہ دہلی اور لکھنؤ کے دبستان حیرت زدہ ہیں۔ اقبال نہ صرف خیالات کے اعتبار سے بلکہ زبان کے اعتبار سے بھی اُردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں' ان نقاطِ نظر کا اظہار اُردو زبان کے رمز شناس اہل فکر نے ''اقبال کے لسانی تصورات اور زبان'' کے موضوع پر منعقدہ سمینار میں کیا۔ جس کا انعقاد اقبال کیڈیمی حیدرآباد کے زیر اہتمام ادارہ ادبیات اُردو ''ایوان اُردو'' پنجہ گٹہ حیدرآباد پر عمل میں آیا۔ اس سمینار میں پروفیسر عبدالستار دلوی سابق صدر شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی، ڈاکٹر محمد ضیاء الدین احمد شکیب سابق استاد انڈولوجی لندن یونیورسٹی نے حصہ لیا۔ پروفیسر مغنی تبسم سابق صدر شعبہ اُردو عثمانیہ یونیورسٹی نے صدارت فرمائی۔ ابتداء میں حافظ قاری سید حبیب اللہ نے آیات الٰہی کی تلاوت فرمائی۔ جناب ضیاء الدین نیر معتمد اقبال اکیڈیمی نے خیر مقدم کیا۔ ڈاکٹر محمد ضیاء الدین احمد شکیب اور پروفیسر عبدالستار دلوی کے عالمانہ اور تجزیاتی مقالات اس

شمارہ میں پیش کئے جارہے ہیں۔

پروفیسر مغنی تبسم سابق صدر شعبۂ اُردو عثمانیہ یونیورسٹی نے اپنے صدارتی کلمات میں فرمایا کہ آج کے اجلاس میں پیش کردہ دونوں مقالے موضوعات کے اعتبار سے بہت ہی نئے تھے، ان پر آج تک بہت کم غور کیا گیا ہے۔ اقبال کا مطالعہ اس پہلو سے بھی کرنا ضروری ہے۔ پروفیسر عبدالستار دلوی کے مقالہ میں مدراس میں اقبال کی تقریر کے حوالہ سے پروفیسر مغنی تبسم نے کہا کہ اس تقریر سے اقبال کے لسانی تصورات پر روشنی پڑتی ہے۔ اقبال کو پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جدید لسانی اور اسلوبیاتی پہلو در آئے ہیں۔ عربی اور فارسی میں یہ رجحان رہا کہ انگریزی کے بہت سے الفاظ کو معرّب اور مفرس کرلیا گیا، اب ہم لفظ کو جوں کا توں قبول کر لیتے ہیں۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد شکیب کے مقالہ کے حوالہ سے صدر اجلاس نے کہا اقبال بڑی دلچسپی سے اردو زبان اور اس کے محاوروں کا مطالعہ کرتے تھے۔ اس بارے میں وہ اپنے دوستوں سے بھی رجوع کرتے تھے۔ مولانا سلیمان ندوی نے اقبال کی فارسی شاعری پر اعتراضات کئے تھے۔ لیکن اقبال نے بیشتر اعتراضات کو قبول نہیں کیا۔ اقبال نے فارسی شعراء کے کلام کی چھان بین کر کے صنعتیں تلاش کیں۔ اقبال کی شاعری کو سمجھنے کے لئے فارسی اور عربی کا جاننا ضروری ہے۔ پروفیسر مغنی تبسم نے فرمایا کہ اُردو زبان کو اقبال نے جس بلندی تک پہنچادیا وہ کسی اور شاعر کے بس کی بات نہیں۔ اقبال نہ صرف خیالات کے اعتبار سے بلکہ زبان کے لحاظ سے بھی اردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں انہوں نے اُردو کو نئی بلندیوں سے روشناس کروایا۔

پیش کردہ مقالوں پر ڈاکٹر حسن الدین صدیقی، ممتاز شاعر راشد آزر اور ڈاکٹر سیادت علی وغیرہ نے سوالات کئے جن کی وضاحت فاضل مقالہ نگاروں نے کی۔ جناب محمد ظہیر الدین نائب صدر اقبال اکیڈیمی کے شکریہ پر اس یادگار محفل کا اختتام عمل میں آیا۔

oooo

جانے والوں کی یاد آتی ہے

ادارہ

آہ!.....جعفر نظام صاحب

نہایت رنج کے ساتھ ادارۂ اقبال اکیڈیمی و اسلامک ہیریٹیج آج اپنے محسن اور بہی خواہ پروفیسر ڈاکٹر جعفر نظام صاحب کو اِن صفحات کے ذریعے سے یاد کررہے ہیں جن کا انتقال ۱۸ر مئی ۲۰۰۴ء کو ہوا۔ مرحوم ایک عرصے سے اپنی گرتی ہوئی صحت کے باوجود بڑی ہمت سے ہمارے جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ مشوروں سے نوازتے تھے اور دامے درمے سخنے ممکنہ مدد فرماتے تھے۔

پروفیسر جعفر نظام، عثمانیہ یونیورسٹی کے مایہ ناز سپوتوں میں سے ایک تھے۔ وہ نباتیات کے پروفیسر اور صدر شعبہ رہے۔ اُن کی قابلیت اور انتظامی صلاحیتوں کے سب معترف تھے۔ اُن کے شاگرد اُنہیں کبھی نہیں بُھلا سکتے۔ حکومت نے اُن کی انتظامی صلاحیت کے پیشِ نظر کاکتیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدے پر دو مرتبہ فائز کیا۔ وہ مختلف فلاحی، ادبی اور تہذیبی انجمنوں سے وابستہ رہے۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو، ڈاکٹر حامد علی ایجوکیشنل ٹرسٹ، طور بیت المال، انجمن ترقی اردو اور ایسے ہی اداروں نے اُن کی بے لوث خدمات سے فایدہ اٹھایا۔

ڈاکٹر جعفر نظام کی سب سے بڑی خوبی اُن کی وسیع النظری اور عالی ظرفی تھی۔ وہ اُصول کے پکّے، قول کے سچّے اور ایک بے ریا اِنسان تھے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

جلسۂ تعزیت میں جناب محمد ظہیر الدین کے تاثرات:

پروفیسر جعفر نظام کی یاد زندگی بھر آتی رہے گی۔ ان کی سادگی، بے پناہ شرافت، تواضع اور انکسار کے نقوش دل پر ثبت ہیں۔ ان کے چاہنے والوں، دوستوں، شاگردوں کا حلقہ وسیع تھا اور ہر ایک ان کے اعلیٰ کردار کا معترف رہا۔ یوں تو وہ اعلیٰ علمی لیاقت اور کئی اعزازات کے حامل تھے۔ لیکن خود نمائی انہیں چھو کر بھی نہیں گئی تھی۔ ان کا گزر جانا اقبال اکیڈیمی اور اسلامک ہریٹیج فاونڈیشن کے لیے ایک گہرا صدمہ ہے۔ اکیڈیمی کے جلسوں میں شریک رہتے، مقالہ نگاروں اور مقررین کی تعریف کرتے، حوصلہ بڑھاتے اور مشوروں سے نوازتے۔ ہفتہ وار درس اقبال کی

محفلوں کے احیاء کی تجویز ان ہی کی تھی۔

اکیڈیمی کے اشتراک سے قائم ہونے والے اسلامک ہیریٹیج فاونڈیشن کے ارکان تاسیسی کے پہلے اجلاس کی انہوں نے صدارت فرمائی جس میں قواعد وضوابط اور لائحہ عمل کے بارے میں انہوں نے کئی اہم مشورے دئے۔ انہیں فاونڈیشن کا صدر منتخب کیا گیا۔ وہ اس ادارہ کے استحکام میں ہمیشہ کوشاں رہے۔ چنانچہ انتقال سے تقریباً ایک ماہ قبل فاونڈیشن کے ارکان تاسیسی کا اجلاس ان کی ہی صدارت میں منعقد ہوا تھا جس میں علاوہ دیگر اُمور کے خصوصاً نمائش سیرت طیبہؐ سے متعلق انہوں نے اپنے مشوروں سے نوازا۔

علمی وادبی جلسوں کے علاوہ وہ اپنے ملنے والوں کے دردوغم کے موقع پر نہ صرف پہنچ جاتے بلکہ ان کا تعلق خاطر موجب تسکین ہوتا۔ ان کی ذات ہمارے لیے ایک نمونہ تھی۔ ایسے اعلیٰ کردار و نیک صفات کے حامل مرد مومن کی مغفرت میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ اللہ پاک انہیں مقامات اعلیٰ سے سرفراز فرمائے۔ آمین

پروفیسر سید سراج الدین صدر اکیڈیمی کا خراج عقیدت

ان میں کتنی شرافت، کتنی نرم دلی، کتنا انکسار اور کتنی خاکساری تھی بیان سے باہر ہے۔ وہ اپنے دکھ کا اظہار کر ہی نہیں سکتے تھے۔ ایسے دور میں جہاں لوگ اپنے آپ کو ڈھکیلتے ہیں وہ پیچھے ہٹ جاتے تھے۔ بہ ہر حال ایک مثالی انسان تھے۔

ع اب ہم ہیں اور ماتم یک شہر آرزو

ooo

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

یہ لکھتے ہوئے بڑا دُکھ ہوتا ہے کہ اُردو کے عاشق' اقبال کے پرستار' صاحبِ طرز شاعر' محقق' نقاد اُردو کے ایمیرٹس پروفیسر' کشادہ دلی اور ملنساری کا بے مثال نمونہ' نعت خوانِ رسولؐ جگن ناتھ آزاد اب ہم میں نہیں رہے۔

؎ ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

جس طرح یہ کہنا دشوار ہے کہ جگن ناتھ آزاد کیا تھے' اسی طرح یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ وہ کیا نہیں تھے۔ آزاد نے لمبی عمر پائی' آخری سانس تک لکھنے پڑھنے کا کام کرتے رہے۔ اردو کو انہوں نے اپنی نظم سے' نثر سے، نقد و نظر سے مالا مال کیا۔ ہر انسان کو ایک نہ ایک دن دنیا سے جانا ہے۔ جگن ناتھ آزاد جاتے جاتے ہمیں اتنا کچھ دے گئے ہیں کہ اُسے پڑھنے اور پرکھنے کے لیے بھی ایک عمر درکار ہوگی۔ جگن ناتھ آزاد تیس (۳۰) سال کی عمر میں اپنا گھر بار چھوڑ کر دہلی آئے۔ وہ ظلم اور بربریت کے ایسے مناظر دیکھ کر آئے تھے کہ اُنہیں کٹر فرقہ پرست ہو جانا چاہیے تھا لیکن اُن کے دردمند دل نے محسوس کیا کہ تقسیمِ ہند کا زخم انسانیت کا زخم تھا۔ اسے مندمل کرنے کی پُرخلوص کوششوں میں وہ جی جان سے لگ گئے۔ پچاس کی دہائی میں ہندوستانی مسلمان سہمے ہوئے تھے۔ اُن کے نزدیک مستقبل واضح نہیں تھا۔ ایسے میں جگن ناتھ آزاد نے اپنی مشہور نظم ''بھارت کے مسلمان'' لکھی جو وقت کی اہم ضرورت تھی۔

جناب جگن ناتھ آزاد کے سانحۂ ارتحال پر اقبال اکیڈیمی کا اظہارِ تعزیت

صف اول کے ماہرِ اقبالیات اور بلند پایہ شاعر جناب جگن ناتھ آزاد کے سانحۂ ارتحال پر جناب محمد ظہیر الدین نائب صدر اکیڈیمی نے اقبال اکیڈیمی کی جانب سے اپنے تعزیتی بیان میں جذبات رنج و الم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آزاد صاحب کا انتقال نہ صرف اُردو والوں کے لیے بلکہ اقبالیات کے طالب علموں کے لیے ایک گہرا صدمہ ہے۔

وہ اس زمانہ سے اقبال پر کہتے اور لکھتے رہے جب کہ تقسیمِ ہند کے بعد مکدّر سیاسی فضا میں لوگ اقبال کا نام لینے سے گریز کیا کرتے تھے۔ انہوں نے نہ صرف برصغیر بلکہ ساری دنیا میں اقبال کے فکر و فن کو پیش کیا۔ اُن کی ذات اور اُردو تہذیب کی شائستگی اور اعلیٰ روایات کی پاس دار تھی۔ وہ اقبال اکیڈیمی کے فاونڈر ممبر تھے۔ صدی تقاریب' عالمی اقبال سمینار کے علاوہ کئی جلسوں میں انہوں نے اپنے مقالے پیش کیے۔ اقبال اکیڈیمی کی جانب سے ان کی خدمت میں اقبال ایوارڈ پیش کیا گیا تھا۔

"IQBAL REVIEW"

(JOURNAL OF THE IQBAL ACADEMY HYDERABAD)

IQBAL ACADEMY

Gulshan-e-Khaleel, 10-5-7/1, Masab Tank, Hyderabad - 500 028, A.P. INDIA